عجیب بات ہے
(افسانے)
سید ظفر ہاشمی

گجرات اردو لٹریری اینڈ کلچرل اکیڈمی (گلکا) احمد آباد کی گیارہویں پیشکش

عجیب بات ہے

(افسانے)

سیّد ظفر ہاشمی

نام کتاب ـــــــ عجیب بات ہے
مصنّف ـــــــ سیّد ظفر ہاشمی
سن اشاعت ـــــــ جون ۱۹۹۰ء
تعداد ـــــــ ۵۰۰
قیمت ـــــــ ۱۵ روپے
مطبع ـــــــ نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ، فیض آباد
کتابت ـــــــ محمد حنیف انصاری

ناشر

گجرات اُردو لٹریری اینڈ کلچرل اکیڈمی (گلکا)

۹ر شاہ عالم، ہاؤسنگ سوسائٹی چنڈولہ لیک، احمدآباد
۳۸۰۰۲۸

اِنتسَابُ

• والدِ محترم سیّد امیر حسن (مرحوم) کے نام

فہرست

شناخت

میر پور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پل کے قریب ایک عورت کی لاش پڑی تھی۔ کسی شخص نے اس کے چہرے پر اپنا رومال ڈال دیا تھا۔ مسافروں کو پانی پلانے والی عورت لاش کے قریب بیٹھی ایک کالے کلوٹے نیم وحشی مریل بچّے کو دودھ پلا رہی تھی۔ بچّے کی عمر پندرہ بیس دن سے زیادہ نہ تھی۔ تماشائیوں کا ایک ہجوم وہاں اکٹھا ہو گیا تھا۔

"کون ہے یہ؟" صفِ اوّل میں اپنی جگہ بناتے ہوئے ایک شخص نے لاش کے بارے میں سوال کیا۔

اس کے قریب کھڑے دو تین شخص نے جواب دیا۔

"فقیرنی لگتی ہے" لیکن فوراً ہی تیسرا شخص بول پڑا۔ مجھے بھکارن لگتی ہے

ان دونوں کی باتیں سن کر ایک چوتھے شخص نے اپنا خیال ظاہر کرنا ضروری سمجھا اس نے کہا —" ایسی کوئی بات نہیں ہے دراصل یہ عورت بھوک اور بیماری سے مرگئی ہے۔ بے چاری — لاوارث ہوگی۔

یہ سن کر ایک اور شخص جوان سب کی باتیں غور سے سن رہا تھا حیرت سے چوتھے کو دیکھتے ہوئے بولا۔

آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اگر لاوارث ہوتی تو یہ بچّہ کہاں سے آتا؟

اس پر چوتھے شخص نے تیز نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا اور تلخی سے بولا،

بچّہ ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اس عورت کا کوئی وارث بھی ہے "

پھر کس بات کا ثبوت ہے" پانچواں بحث پر اتر آیا۔ اور اس سے پہلے کہ چوتھا کوئی اور بچّے کی حالت نزول اور مقصد وجود پر روشنی ڈالتا پہلے نے بور ہو کر اپنا سوال دہرایا۔

" لیکن میں پوچھتا ہوں کہ یہ عورت کون ہے؟"

" یہی تو ہم اندازہ لگا رہے ہیں۔" — دوسرا شخص جس نے عورت کو فقیرنی تصوّر کیا تھا بڑے فلسفیانہ انداز میں بولا۔

" مگر اس طرح تو معلوم نہ ہو سکے گا۔ کہ یہ کون ہے" پہلے نے شبہ ظاہر کیا

" تو کس طرح معلوم ہوگا" — وہ شخص جس نے اس عورت کو بھکارن گردانا تھا۔ لپک کر پہلے کے قریب آگیا۔ اور اس سے قبل کہ مسئلہ کا حل

ہاتھ پاؤں کی حرکت سے ہونا شروع ہو جاتا۔ ایک چھٹے شخص نے مداخلت کر دی۔ جب کوئی ثبوت نہیں، کوئی گواہ نہیں، واقعات کا کسی کو علم نہیں پھر فیصلہ کیوں کر ہو؟"۔

"کوئی وکیل لگتا ہے۔" کسی نے پیچھے سے آواز لگائی جس پر ایک زبردست قہقہہ پڑا۔ دودھ پلانے والی عورت کو اس ٹھٹھول پر غصہ آگیا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا۔

آپ لوگوں کو شرم نہیں آتی۔ ایک لاش پڑی ہے اور آپ لوگوں کو دل لگی سوجھ رہی ہے۔"

یہ سن کر لوگ بظاہر شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے اور ماحول پر خاموشی چھا گئی۔ چند منٹوں بعد پہلا شخص پھر بڑبڑایا۔

"لیکن یہ ہے کون؟"

اس بار دودھ پلانے والی عورت نے اسے براہ راست جھڑکا۔

"اب آپ چپ رہیں تو اچھا ہو، اگر زبان میں زیادہ کھجلی ہو رہی ہو تو یہاں سے چلے جائیے"

یا گلے میں تختی لٹکا لیجیے جس پر لکھا ہو — "یہ ہے کون" کسی اور نے لقمہ دے دیا جس پر کچھ لوگ پھر ہنسے۔ لیکن پہلا شخص بگڑ گیا اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"آخر یہ تو معلوم ہی کرنا پڑے گا کہ یہ لاش کس کی ہے۔"

اس کی خستہ حالت دیکھ کر بغل میں کھڑے ایک شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور سمجھاتے ہوئے بولا۔

"بھائی صاحب ابھی پولیس آجائے گی۔ تو پتہ چل جائے گا آپ اتنا پریشان کیوں ہیں۔؟"

اسی وقت دو سپاہی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہاں آگئے اور کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں ایک لال ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ اور دوسرا لال پگڑی باندھے ہوئے تھا دونوں نے بڑے غور سے لاش کے سراپا کو دیکھا پھر گوشت کے اس لوتھڑے کو دلچسپی سے دیکھا جو شیشی سے دھیرے دھیرے دودھ چوس رہا تھا۔ چند سکنڈ بعد دونوں نے ایک ساتھ گردن ہلائی۔ اور ایک ساتھ بولے۔

"یہ ہے کون؟"

ان کے منہ سے اتنا نکلنا تھا کہ پہلا جوش میں آکر بولا۔

"یہی تو میں خود اتنی دیر سے پوچھ رہا ہوں"

پگڑی والے سپاہی نے پہلے تو اسے گھور کر دیکھا۔ پھر گھڑک کر پوچھا۔

"کس سے پوچھ رہے ہیں اور آپ ہیں کون؟"

اس اچانک سوال پر پہلا گھبرا گیا۔ اور ہڑبڑا کر بولا۔

"میں۔ میں بمبئی جا رہا ہوں۔"

تو جائیے۔ یہاں کیا تماشہ لگا رکھا ہے" اس بار ٹوپی والے سپاہی نے للکارا۔ پھر وہ دوسروں سے مخاطب ہوا۔ آپ سب لوگ جائیے یہاں

بھیڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ کوئی کھیل تو ہو نہیں رہا ہے۔ معمولی سی بات ہے ایک بھکارن مرگئی ہے بس۔

یہ سنتے ہی تیسرا جس نے مردہ عورت کو بھکارن بوجھا تھا۔ اچھل پڑا ـــــ

" دیکھا میں کہتا تھا نہ کہ بھکارن ہے"

پگڑی والے سپاہی نے اسے بھی غور سے دیکھا۔ اور پوچھا آپ کی تعریف"

وہ بولا۔ اے، پی بندوق والا۔"

ٹوپی والے سپاہی نے اس کی کمر میں اپنا ڈنڈا چبھویا اور کہا۔"

" شری بندوق والا آپ کہیں اور جاکر چھوٹیے۔ ایک لاوارث لاش کے پاس کیا کر رہے ہیں ۔"

اس مذاق پر مجمع نے پھر ایک قہقہہ لگایا۔ جس پر دونوں سپاہیوں نے اپنا ڈنڈا ہوا میں لہرا دیا۔ اور گرج کر بولے۔

"ہالٹ"

سب چپ ہو گئے۔ ویسے منہ پھیر کر کچھ لوگ اب بھی ہنس رہے تھے۔ لیکن مجموعی طور پر خاموشی چھا گئی۔ تھوڑی دیر بعد چوتھے نے ٹوپی والے سپاہی سے بڑی عاجزی اور انکساری سے کہا۔

حولدار صاحب آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ یہ لاوارث ہے میں نے اپنی رائے ظاہر کی تھی لیکن کوئی مانتا ہی نہیں۔"

پگڑی والے سپاہی نے اسے شرارت سے دیکھا۔

اور بولا۔

"تو آپ کا کیا بگڑ گیا مہاراج کیا آپ بھی لاوارث ہیں
اور کس نے کہا تھا کہ آپ اپنی رائے ظاہر کیجیے"

کھی کھی کی آوازیں پھر آنے لگیں۔ اور جو تھا شرمندہ ہو گیا۔ اس نے گردن جھکالی۔

اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا۔ چند منٹوں بعد پگڑی والا سپاہی اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔

"پر یہ تو واقعی معلوم کرنا پڑے گا کہ یہ ہے کون؟"

وہ تو ہے۔ ٹوپی والا فوراً متفق ہو گیا"

ایسا کیا جائے کہ اس کے چہرے سے رومال ہٹا کر دیکھا جائے شاید کچھ اتا پتا چل جائے۔

"آئیڈیا" ٹوپی والا سپاہی پھر فوراً متفق ہو گیا۔ اس پر پگڑی والے سپاہی نے اپنے ڈنڈے سے لاش کے چہرے پر پڑا رومال ہٹایا۔
پورے مجمع کی نگاہ لاش پر جم گئی۔

تیس تیئیس سال کی عمر، بے رونق پتھرائی آنکھیں، سپاٹ چہرہ، بے رنگ ونشان پیشانی۔

"شاید"

پگڑی والے سپاہی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ٹوپی والے نے بات کاٹ دی۔
"لیکن اس قسم کی عورت ایسی ہی ہوگی۔ نشان وشان کہاں ہوگا"
گلے میں بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔۔ پگڑی والے نے ذرا قریب سے

لاش کو دیکھا ۔ " پاگل ہو گئے ہو کچرے سے دانا چننے والی عورت کے گلے میں کیا ہو گا۔" ٹوپی والا بولا۔

اس پر پگڑی والے سپاہی نے ٹوپی والے سپاہی سے کہا ۔" ذرا تم قریب سے دیکھو کوئی نشان کہیں دکھائی دے رہا ہے۔" ؟

ٹوپی والا سپاہی لاش کے قریب آیا۔ اس نے جھک کر اس کا بغور معائنہ کیا ۔ اور نفی میں گردن ہلا دی۔

پگڑی والے سپاہی کے چہرے پر الجھن اور مایوسی کے آثار نمایاں ہو گئے " پھر کس کو سونپا جائے جب تک کہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ ہے کون" یعنی ہندو ہے یا مسلمان یا کچھ اور وہ بڑبڑایا ۔

اس کی بڑبڑاہٹ سن کر وہ شخص جس نے سب سے پہلے پوچھا تھا کہ یہ ہے کون ــــ جلدی سے بولا ۔

" دراصل میرا بار بار پوچھنے کا مقصد بھی یہی تھا کہ سب سے پہلے یہ پتہ لگایا جائے کہ یہ ہندو ہے یا مسلمان یا کچھ اور"

" ہاں۔ یہی تو میں بھی جاننا چاہتا تھا" دوسرا بولا۔

" مجھے بھی یہی معلوم کرنا تھا۔ تیسرا بولا ۔

" اور میرا دل بھی یہی سوال کر رہا تھا" چوتھا بولا ۔

پھر کئی لوگ ایک ساتھ بولے ۔

" ہاں ہاں یہ تو بہت ضروری ہے ۔ پہلے یہ معلوم کرو کہ یہ کس ذات کی ہے ۔" اس کے بعد سب نے باتیں کرنی شروع کر دیں۔

اور ایک بھنبھناہٹ لاش کے ارد گرد منڈلانے لگی۔ بچہ آواز سے گھبرا گیا۔ اس نے دودھ پینا بند کر دیا۔ دودھ پلانے والی عورت نے بے بسی سے سب کو دیکھا اور بچے کو اٹھا کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔

اسی وقت ایک شخص مجمع چیرتا ہوا سب سے آگے آکر کھڑا ہو گیا۔ اور بآواز بلند اعلان کیا۔

"یہ مسلمان عورت کی لاش ہے۔"

سب نے ایک ساتھ اس شخص کو دیکھا کچھ کو غصہ آیا، کچھ خوش ہوئے اور کچھ اس بھیڑ میں ایسے ناسمجھ اور غیر وابستہ بھی تھے۔ جن کے پلّے کچھ نہ پڑا اور وہ ہنسنے لگے۔

پگڑی والا سپاہی ان کے قریب گیا اور پوچھا۔

پہلے یہ بتائیے کہ آپ کون ہیں؟ اور آپ کو آتے ہی کیسے پتہ چل گیا کہ یہ مسلمان عورت کی لاش ہے۔"

اس شخص نے لاش کو دوبارہ دیکھا۔ گردن ہلائی اور بولا۔

"میرا نام احمد داؤد کارپوریٹر ہے۔ فلاحِ عامہ ٹرسٹ کا مینجنگ ٹرسٹی ہوں اس کے علاوہ کارپوریشن کی ہیلتھ اور پبلک ویلفیر کمیٹی کا چیرمین بھی ہوں۔"

دونوں سپاہی اپنی اپنی پوسٹ میں فوراً سمٹ گئے۔ انہوں نے الرٹ ہو کر احمد داؤد کو سلوٹ کیا۔ احمد داؤد مسکرائے اور مجمع پر فاتحانہ نظر ڈالتے ہوئے بولے۔

" دراصل ہوا یوں کہ کل شام یہ عورت میرے آفس میں آئی تھی اور اس نے اپنا نام امیرن بتایا تھا۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے اس نیم جان بچے کو دیکھا۔ جو پانی پلانے والی عورت کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ پھر بولے۔

" یہ عورت چاہتی تھی کہ ہم اپنے یتیم خانے میں اس بچے کو رکھ لیں۔ ہم نے جب بچے کے باپ کا نام پوچھا۔ تو عورت بڑی بے حیائی سے بولی " ایک ہو تو بتاؤں " ۔ اور چونکہ ناجائز بچوں کو ہم اپنے یتیم خانہ میں نہیں رکھتے اس لئے ہمیں انکار کرنا پڑا۔"

" لیکن یہ عورت یہاں آکر مری کیسے "۔ کسی شخص نے بیچ میں سوال کر دیا۔

احمد داؤد نے برا سا منہ بنایا۔ بولے۔

اب ہمیں کیا معلوم۔ ہم نے موت کے فرشتے کو اس کے تعاقب میں تو لگا نہیں دیا تھا۔ البتہ یہ عورت بھوک سے بے حال تھی۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ کہیں کوئی کام مل جاتا تو دو وقت کی روٹی کا انتظام ہو جاتا۔ لیکن عورت بد چلن تھی دیکھتے ہوئے مکھی کون کھاتا۔ ایسی صورت میں ہم کیا کرتے اور کرتے بھی تو کس طرح۔ نہ جانے ایسے کتنے لوگ منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔

ان کا بیان سن کر پہلا شخص جس نے سب سے پہلے شناخت کا سوال اٹھایا تھا، خوش ہو کر بولا۔

" تو ثابت یہ ہوا کہ یہ مسلمان عورت کی لاش ہے۔"

"الحمد للہ"۔ احمد داؤد نے حلق سے آواز نکالی - اور اسی لئے اس کی تجہیز و تکفین کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ سپاہیوں سے مخاطب ہوئے۔

آپ لوگ میرے ساتھ پولس اسٹیشن چلیں - وہاں کاغذات مکمل کر لیتے ہیں۔ اور فلاح عامہ اس مردہ عورت کو اپنی تحویل میں لیتا ہے کہ یہ ہمارا فرض ہے

احمد داؤد کے منہ سے ابھی پورا جملہ بھی نہ نکلا تھا کہ پانی پلانے والی عورت گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے بچے کو اپنی چھاتی سے الگ کرتے ہوئے پوچھا

"اور یہ زندہ بچہ"

احمد داؤد نے بڑی خفگی سے اسے دیکھا اور جھڑک کر بولے۔

اس امر پر ہم اپنا خیال پہلے ہی ظاہر کر چکے ہیں، کوئی گنجائش نہیں۔

"اتنا کہہ کر انھوں نے پولس والوں کو ساتھ لیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے گیٹ سے باہر نکل گئے۔

اس کے فوراً بعد صابن کی جھاگ کی طرح پورا مجمع چھٹ گیا اور پانی پلانے والی عورت بچے کو سینے سے لگائے لاش کے پاس تنہا رہ گئی ــــ

لوٹ پیچھے کی طرف

شاہ زمانی کی درگاہ شریف کے دوسرے دروازے کے سامنے سے ہنڈولا تالاب کی طرف چلتے ہوئے روحیلہ نے فقیروں کی ایک ٹولی دیکھی تو گھبرا کر اپنی ماں کو پکڑ لیا۔

"بڑی! بھاگو۔ یہ لوگ ابھی لپٹ جائیں گے تو ہمارے جسم پر ایک بھی بوٹی نہ بچے گی۔"

روحیلہ اپنی ماں کو بڑی کہتی تھی۔ شاید اس لیے کہ دونوں ماں بیٹی کم اور بہنیں زیادہ دکھائی دیتی تھیں۔ فرق صرف بڑی اور چھوٹی کا تھا۔ ماں بھنویں نوچ کر ابرو خم دار رکھتی تھی، چہرے پر فیس پیک لیپ لگا کر چٹیل بناتی تھی بالوں کو براؤن خضاب سے رنگتی تھی آنکھوں کے نیچے کمبخت ذرا ذرا حلقے پڑنے لگے تھے۔ ان کو پیچ کرتی تھی اور بڑے گلے کا سلیولیس بلاؤز پہنتی تھی۔ پہنتی خیر کیا تھی چار گرہ کپڑا بدن سے چپکا رہتا تھا جیسے تیسے اور چلتے وقت قدم یوں اٹھاتی تھی کہ شعر ؎

چلے تو پاؤں کے نیچے کچل گئی کوئی شے
نشہ کی جھونک میں دیکھا نہیں کہ دنیا ہے

صادق آجاتا تھا۔

یہ تھی بڑی اور روحیلہ کی تو خیر عمر ہی ایسی تھی کہ خواہ مخواہ ہر چیز چکھنے کا جی چاہتا تھا چاہے زمین پر رینگتا ہوا کیڑا ہو یا اندرون ستر کلبلاتی ہوئی کوئی شے۔ دونوں ساتھ چلتیں تو تجربہ کار دیدہ ور بھی فیصلہ نہیں کر پاتے کہ پروانہ اِدھر جائے گا یا اُدھر۔

بڑی اوئی کہہ کر جو اچھلی تو انور صاحب سے ٹکرا گئی وہ اس وقت ناک پر رومال رکھے اپنی سیدھ میں چل رہے تھے۔ رومال تو جیب سے انھوں نے اسی وقت نکال لیا تھا جب وہ درگاہ شاہ زمانی کے پہلے دروازے پر ٹیکسی سے اترے تھے۔ انھیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ درگاہ شاہ زمانی کے دو دروازے ہیں اور انھیں دوسرے دروازے پر اترنا ہے۔ اور پھر وہاں سے منزل کی تلاش شروع کرنی ہے۔ پہلا دروازہ آیا تو انہوں نے سمجھا کہ یہی ٹیکسی چھوڑنے کی جگہ ہے۔ اور انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ ٹیکسی سے اترے تو انہیں فوراً احساس ہو گیا کہ جیب سے رومال نکالنے کی اشد ضرورت ہے۔ انہوں نے رومال نکالا اسے ناک پر رکھا اور آگے بڑھتے گئے۔ شاہ زمانی کی آبادی پہلے دروازے سے شروع ہو گئی تھی۔ وہ گھبرا گھبرا کر دائیں بائیں دیکھتے پھر تیز تیز چلنے لگتے۔ ویسے دایاں کیا اور بایاں کیا دونوں ہی طرف غلیظ دوکانیں بے ڈھنگی دوکانیں، بے ترتیب اور غیر معیاری مکانات، گندے ہوٹل ان میں کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھے بھسنڈی لوگ جو بات بات پر قہقہہ لگاتے تھے۔ اتنی زور سے ہنستے تھے کہ انور صاحب کی پوری زندگی کی ہنسی کو جوڑا جاتا تو بھی ان لوگوں کا ایک قہقہہ نہ بنتا۔ نہیں معلوم ان پست لوگوں میں اتنے سارے قہقہے کیسے سما گئے۔

ہیں ۔ انور صاحب سوچ سوچ کر حیرت زدہ ہوتے ۔ انھوں نے صرف مسکراہٹ دیکھی تھی ۔ ایسی کہ اِدھر جگنو چمکا ادھر بجھا ۔ حد سے حد ہنسی دیکھی تھی ۔ مگر وہ بھی زکامی کھانسی کے ایک جھٹکے کی طرح کہ آدابِ محفل کا خیال رکھتے ہوئے فوراً دبا دی جائے اور یہاں دیکھو تو لوگ قہقہہ اس طرح لگاتے ہیں جیسے پٹاخے چھوٹ رہے ہوں ۔ اور وہ بھی ایک آواز ایک ترنگ میں نہیں بلکہ کئی کھٹکوں کے ساتھ اوپر سے نان بائی کی پھٹا پھٹ اور تنور میں جلتی ہوئی لکڑیوں کی چٹا چٹ ۔

اوہ مائی گاڈ

انور صاحب گرتے گرتے بچے ۔ اسی وقت شاہ زمانی کی مسجد سے مغرب کی اذان گونجی ۔

اللہ اکبر اللہ اکبر

تینوں کی رفتار تیز ہو گئی ۔ " جلدی چلو اندھیرا ہو جائے گا تو اس گندی بستی میں ہم کھو جائیں گے ۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ دیسی شراب کی بھٹیاں سن سیٹ کے بعد گرم کی جاتی ہیں " ۔ روحیلہ نے گھبرا کر کہا ۔ اس پر ٹری بولی ۔ " سن سیٹ ابھی کہاں ہوا ہے ابھی میری گھڑی کے ڈائل میں روشنی نہیں آئی ۔

لیکن یہ اذان ؟

انور صاحب کی یادوں کے دریچے سے ان کے بچپن کا کوئی واقعہ گزرنے لگا ۔

" ایک بار ایسا ہوا " انہوں نے کہنا شروع کیا ۔ " تب میں بہت چھوٹا تھا روزے بارش میں پڑے ایک دن بادل اتنے گہرے تھے کہ دن میں شام کا گمان ہونے لگا ۔ ہمارے گاؤں کی مسجد کے امام نے سمجھا کہ سورج غروب ہو گیا ، انہوں

نے اذان دے دی - لوگوں نے روزہ افطار کر ڈالا - تھوڑی دیر بعد بادل ذرا چھٹا تو دھوپ نکل آئی - سب نے امام صاحب کو خوب لتاڑا۔"

اتنا کہہ کر انور صاحب ہنس پڑے - ویسے تو ان کی ہنسی کافی محتاط تھی - پھر بھی بڑی خفا ہو گئی۔

یہ قبل از تاریخ کی باتیں ہیں۔ اب ان کا ذکر کرنا حماقت ہے - یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ آج بھی اذانوں کو دن ڈوبنے کا اعلانیہ سمجھتے ہیں - خیر چھوڑو ان باتوں کو سورج اگر ڈوبا نہیں ہے تو ڈوب جائے گا - دھوپ تو کہیں دکھائی نہیں دے رہی ہے اس لیے اندھیرا ہو سکتا ہے - لیکن راستہ بڑا خراب ہے گرنے کا خطرہ ہے بیٹی روحیلہ ذرا سنبھلنا تمہارے سینڈل کی ایڑی زیادہ ہی اونچی ہے -

"ڈیڈی کی ناک کی طرح"

روحیلہ نے انور صاحب کی طرف دیکھا جو اپنی ناک کو مسلسل رومال سے دبائے ہوئے تھے - دونوں ماں بیٹی ہنس پڑیں - مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی سننے نہ پائے -

روحیلہ اپنے باپ کو ڈیڈ کہتی تھی - املا میں فرق ہو سکتا ہے لیکن تلفظ تیس موت ہی سے قریب تھا - ویسے انور صاحب پوری طرح زندہ ہی کہاں تھے - زندہ تو ان کی بیوی تھی - وہ تو بس اس طوطے کی طرح تھے جو پنجرہ میں بند تھا اور سمندر کی تہہ میں جن کے قبضے میں تھا -

بیٹی کے طنز پر انہوں نے رومال ناک سے ہٹایا مگر دوسرے لمحے ہی انھیں متلی آنے لگی - اور وہ واوا کرنے لگے -

بڑی نے جلدی سے پرس کھولا - الائچی نکالی - ایک الائچی انور صاحب کی

طرف بڑھائی، دوسری اپنے منہ میں رکھی اور تیسری روحیلہ کو دینے لگی تو وہ بولی۔"
مجھے شگر کوٹیڈ ٹیبلیس دو۔ الائچی آؤٹ ڈیٹیڈ ہوگئی ہے۔"

بڑی نے مسکرا کر اس کی کمر کو دبایا ___ اسٹوپڈ

انور صاحب الائچی چباتے ہوئے بولے۔ "مجھے یاد آتا ہے جب میں بہت چھوٹا تھا۔ ان دنوں میں اپنے آبائی گاؤں میں رہتا تھا۔ میرے دادا روزانہ شام کے وقت تکیہ شاہ کے مزار تک ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ اور مجھے بھی ساتھ لیجاتے تھے۔ ایک دن واپسی پر مجھے زمین پر پڑی ہوئی ایک الائچی دکھائی دی جو عام الائچی سے کم از کم چار گنا بڑی تھی اور سفید ایسی جیسے دودھ۔ میں نے اٹھانا چاہا تو دادا نے روک دیا۔ کہا اسے مت اٹھانا یہ جنوں کی الائچی ہے۔ پھر اوپر منہ کرکے زور سے سانس لی اور کہا سونگھو کیسی خوشبو آرہی ہے ابھی ابھی ادھر سے جن گزرے ہیں۔"

انور صاحب کی باتیں سن کر روحیلہ نے تو مزہ لیا لیکن بڑی خفا ہوگئی۔
"نان سینس آپ نے جنوں کی خوشبو سونگھی ہوگی لیکن اس وقت تو میری ناک میں اتنے قسم کی بدبو گھسی جارہی ہے کہ تمیز کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ کہ کس چیز کی بدبو ہے۔ سڑے ہوئے گوشت کی یا پکی ہوئی مچھلی کی، لیٹرن کی یا اگربتی کی مختلف قسم کی بدبو دھوئیں کے ساتھ گڈمڈ ہوگئی ہے۔"

"بڑی"

'یس بیبی'

اگربتی مہکتی ہے بدبو نہیں کرتی۔ روحیلہ نے اپنے علم کا اظہار کیا۔ اس پر

بڑی نے اسے جھڑک لیا۔

"کوئی اگربتی دگربتی مہکتی نہیں۔ مہکتا تو صرف فرانسیسی سینٹ ہے۔ لیکن کمبخت یہاں کی گھٹن اور سڑاندھ ہمارے کپڑوں پر اسپرے کئے گئے پرفیوم پر حاوی ہو گئی ہے" اتنا کہہ کر اس نے کرختگی سے اپنے شوہر انور صاحب سے پوچھا۔

" فارگاڈسیک یہ بتائیے کہ آپ ہمیں کہاں لئے جا رہے ہیں"۔

انور صاحب کو یہ سوال بے تکا لگا۔ جزبز ہو کر بولے۔

" کمال کرتی ہو جانتی ہو کہ شاہ زمانی سوسائٹی میں کرایہ پر مکان لیا ہے۔ وہیں جا رہے ہیں، پھر بھی پوچھتی ہو کہاں جا رہے ہیں"۔

"لیکن یہ آپ کی سوسائٹی ہے کہاں۔ ہم اس پل صراط سے صحیح سالم نکل جائیں گے۔ کیا آپ کو یقین ہے؟"

روحیلہ نے دفعتاً منہ سے سیٹی بجائی۔ بولی فنٹاسٹک

"کیا فنٹاسٹک" بڑی نے اسے ڈانٹا۔

"پل صراط" روحیلہ نے پھر سیٹی بجائی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کوئی سننے نہ پائے۔

"کیسا پل صراط" بڑی کا غصہ بڑھ گیا۔ اس پر روحیلہ نے اطمینان سے کہا۔

"بڑی تم پر اس آبادی کا اثر پڑنے لگا ہے۔ تم مسلمان ہو رہی ہو۔ پل صراط لفظ کا استعمال شاید تم نے زندگی میں پہلی بار کیا ہے۔ کسی انگریزی ناول میں پڑھا ہو گا۔

"شٹ اپ"

"او کے"

انور صاحب نے جلدی سے مداخلت کی۔" بھئی تم دونوں چیخ چیخ مت کرو پل صراط پر مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ بقرا عید کے دن ہمارے یہاں بکرے کی قربانی ہوتی تھی۔ ایک بکرا تھا ہمارے یہاں بڑا غصور۔ دادا جان اپنے ہاتھوں میں ایک تختی لے لیا کرتے تھے۔ اور اسے للکارتے تھے۔ وہ دوڑ کر آتا تھا اور کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ اس تختی پر مارنے لگتا تھا۔ جب تھک ہار جاتا تو بھاگ جاتا۔ ایک سال اس کی قربانی ہونے لگی تو میں نے دادا جان سے کہا کہ اس بکرے کی قربانی اپنے نام سے نہ کرائیں۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو میں نے کہا، وہ آپ کو پل صراط سے نیچے گرا دے گا۔ اور آپ نے جتنا اس کو ستایا ہے اس کا بدلہ لے لے گا۔ میری اس بات پر دادا جان بہت ہنسے تھے۔

انور صاحب کی بات سن کر روحیلہ ہنس پڑی۔ لیکن بڑی خفا ہو گئی۔

آپ کی بات پر صرف بے وقوف ہی ہنس سکتا ہے۔ آخر آپ کو اپنے بچپن کی ساری حماقتیں کیوں یاد ہیں۔ کیا آپ میں بھولنے کی صلاحیت مفقود ہے۔

انور صاحب سٹک گئے۔ روحیلہ بھی چپ ہو گئی۔ اس کے بعد تینوں خاموشی سے چلنے لگے۔ سڑک کے دونوں طرف جھگی جھونپڑیوں کا لامتناہی سلسلہ تھا گھاس پھوس کی جھونپڑیاں، کچی دیواروں کی جھونپڑیاں، ادھ پکی جھونپڑیاں ان سے نکلتے ہوئے لکڑیوں اور کوئلوں کے دھوئیں، اندر سے جھانکتی ہوئی ٹمٹماتے دئے کی روشنی، دروازے پر پڑا ٹاٹ کا پردہ۔ سامنے بہتی

ہوئی نالیاں، اور ٹھہرے ہوئے پانی کے گڈھے، بچوں کی چیخ و پکار، عورتوں کی ڈانٹ ڈپٹ، مردوں کی گھن گرج۔ ریڈیو کا شور وغل، اور رہ رہ کر ٹھنکارتا ہوا قہقہہ

"یہ لوگ اتنا ہنستے کیوں ہیں؟" بڑی کو ان کی ہنسی سخت ناگوار تھی۔ جانور سے بدتر ان کی زندگی۔ اس طرح سوراخوں میں رہتے ہیں۔ جیسے چوہے ہوں، پھر بھی اتنی زور سے ہنستے ہیں۔ کہ مہذب آدمی کا دل بند ہو جائے۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد بڑی نے انور صاحب سے کہا۔ "کسی سے پوچھو کہ شاہ جی والے سوسائٹی کہاں ہے۔"

"شاہ جی والی نہیں۔ شاہ زمانی" انور صاحب بولے۔

"کچھ بھی ہو لیکن ہے کہاں۔ یہ مسلمان لوگ کیسے کیسے نام رکھ لیتے ہیں۔ ہماری دلی میں تو ایسے خوبصورت خوبصورت نام نئی بستیوں کے رکھے جاتے ہیں کہ طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔ فلورنس گارڈن، ڈاؤن دی ہل، بلیک ہارس، وہائٹ جیسمین، اور یہ لوگ نام رکھتے ہیں۔ شاہ زمانی۔ خلیفہ فتیلے شاہ۔ دائرہ پیر دستگیر ہوں۔"

اس پر روجیلہ نے اپنی ماں کو چھیڑا۔

"لیکن بڑی دہلی میں تم نے پوشش لو کالونی دیکھی ہے۔ بلی ماران اور چتلی قبر کا نام کبھی سنا ہے؟"

"سنا ہے اسی کا تو رونا ہے۔"

"تو اب رونا بند کرو" انور صاحب کو بھی مذاق سوجھا۔ لیکن بڑی کو یہ مذاق ناگوار گزرا، تلخی سے بولی

" بند تو کردوں مگر اس کا کروچ اسٹریٹ سے مجھے نکالو تب نہ کسی سے پوچھتے کیوں نہیں کہ شاہ والی سوسائٹی کہاں ہے۔"

انور صاحب رکے۔ جھجکے ادھر اُدھر دیکھا اور ڈرے سہمے ایک جھونپڑے کی طرف بڑھے اس سے پہلے کہ وہ دروازے تک پہونچتے اندر سے تین آدمی ایک ایک نکلے ایک عورت ایک مرد اور ایک دس بارہ سال کی لڑکی۔ تینوں نے ایک ساتھ ان تینوں کو دیکھا۔ پھر مرد بولا۔

'کیا ہے صاحب'

" ہمیں شاہ زمانی سوسائٹی میں جانا ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو وہ کہاں ہے؟"

ہاں صاحب آپ سیدھے چلے جائیں۔ تھوڑی دور پر داہنی طرف ایک کباڑ خانہ ملے گا۔ وہیں سے ڈھلوان شروع ہو جاتی ہے۔ ڈھلوان کے قدموں میں یہ سوسائٹی ہے نئی سوسائٹی ہے۔ ابھی تھوڑے ہی لوگ رہنے کے لئے آئے کیا آپ بھی یہاں رہنے کے لئے آئے ہیں ۔"

'ہاں'

چلو اچھا ہوا۔ ہمارے بیچ بھلے لوگ رہیں گے تو ہمارا بھی بھلا ہو گا۔ ہم تو یہاں پڑھے لکھے لوگوں کی صورتوں تک کو ترستے ہیں۔ آپ لوگوں کی وجہ سے یہاں کا ماحول بھی بدلے گا۔ ہمارا مقدر بھی جاگے گا۔

اس بیچ لڑکی روحیلا اور بڑی کے پاس پہنچ گئی۔ اس نے انھیں غور سے دیکھا پھر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ آپ سینما میں کام کرتی ہیں؟"

" ہٹ یہاں سے" بڑی نے اتنی زور سے ڈانٹا کہ وہ بے چاری سہم

کر گھر کے اندر بھاگ گئی۔

تینوں پھر چلے۔ جب تک یہ لوگ سیدھے سیدھے چل رہے تھے کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی تھی۔ کوئی کوئی اچٹتی نظر ڈال لیتا تو ڈال لیتا ورنہ راہ گیروں کو دھیان سے دیکھنے کی ضرورت کس کو تھی۔ لیکن جب ان لوگوں کو پوچھ گچھ کرتے دیکھا تو وہاں کے لوگوں کو دلچسپی ہوئی اور کئی لوگ انہیں غور سے دیکھنے لگے

باہر سے آئے ہوئے لگتے ہیں۔

کسی کا مکان ڈھونڈ رہے ہیں

شاید نئی سوسائٹی میں جانا چاہتے ہیں۔

بڑے آدمی دکھائی دیتے ہیں۔

وہ لوگ آپس میں قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا چلو معلوم کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے وہی لوگ ہوں۔ مارفیتا صاحب نے کہا تھا۔ کہ وہ لوگ آئیں گے۔

چار پانچ آدمی لنگیاں پہنے ہوئے ان کی طرف بڑھے بڑی نے جلدی سے گلے سے زنجیر اور کلائی سے چوڑی اتاری اور انہیں پرس میں ڈال لیا۔ ردھیلیہ کا ہاتھ ناک، کان، گلا سب خالی تھا اس لئے اسے کسی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے پاس صرف جسم تھا اور بلاشبہ وہ بہت خوبصورت اور بے حد قیمتی تھا۔ لیکن اسے چھپاتی کہاں اور کس طرح۔ وہ لوگ قریب آئے۔ ان میں سے ایک نے بڑے ادب سے پوچھا

"کیا ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔"

برٹی کو ریلوے اسٹیشن پر لگا بورڈ یاد آگیا۔ جہاں پولیس کا ایک آدمی بیٹھا اونگھا کرتا ہے اور محض اس ڈر سے کہ کہیں وہ سامان کی تلاشی نہ لینے لگے اور ایک آدھ سامان مار نہ دے کوئی مسافر اس کے پاس پھٹکتا تک نہیں ۔

اس نے غور سے اس شخص کو دیکھا۔ لنگی اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ چھوٹی سی داڑھی بھی تھی، سر چکنا تھا۔ یہ بات برٹی کو نہ معلوم ہو سکی کہ اس کا سر گھٹا ہوا تھا یا وہ گنجا تھا۔ قد ٹھگنا تھا وہ ٹیڑھا کھڑا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ چھوٹی ہے ۔ برٹی کو کالج کے زمانے کا ایک ڈرامہ یاد آگیا " فردوس بریں' اس میں ایک کردار تھا شیخ للّو، بالکل اِس شخص سے ملتا جلتا پہلا انعام اُسی کردار کو ملا تھا۔ کیا ایکٹنگ کی تھی غضب کر دیا تھا۔ بچّہ بچّہ اس سے متنفر ہو گیا تھا اور پہلا انعام وہ مار لے گیا تھا۔

اس نے نفرت سے منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

ہم شاہ زمانی سوسائٹی تلاش کر رہے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے وہ کہاں ہے ۔ انور صاحب نے پوچھا۔ اس شخص کی آنکھوں میں خوشی تیرنے لگی ۔

کیا آپ انور صاحب ہیں؟

" جی ہاں"

کیا آپ بدرالدین نورالدین مارفیتا کے مکان میں رہنے کے لئے آئے ہیں ؟ "

" جی ہاں ۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا "

" مجھے مارفیتا صاحب نے بتایا تھا کہ آپ لوگ آج آنے والے ہیں ۔

ہم انتظار ہی کر رہے تھے - چلئے آپ کو مکان دکھا دیں ۔"

وہ آگے بڑھنے لگا تو بڑی بولی

پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو - اس نے اس عرصے میں کان کی بالی بھی نکال کر پرس میں ڈال لیا تھا - بڑی کے سوال پر وہ شخص چند لمحے کے لیے ٹھٹھکا پھر بولا ۔
میرا نام حامد علی ہے - میں منڈولا تالاب کی سر سبیل کمیٹی کا سکریٹری ہوں ۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہاں دنگا فساد تو روز ہوتا ہوگا - دوسرے تیسرے دن قتل بھی ہوتا ہوگا - جوئے بھی رات بھر کھیلے جاتے ہوں گے - اور شراب کی بھٹی تو ہر گھر میں ہوگی ۔ ہے نا "

بڑی نے اس طرح پوچھا - جیسے ان سب کی خیریت پوچھ رہی ہو ۔ بڑی کی بات سن کر سبھوں کے چہرے اتر گئے - چند لمحوں تک کوئی کچھ نہ بولا - پھر حامد علی نے ہمت کی -

" بیگم صاحبہ یہ غریبوں محتاجوں کی بستی ضرور ہے - لیکن یہاں بھی محنت کش لوگ رہتے ہیں - ہم جھونپڑوں والوں کے بارے میں لوگوں کو بڑی غلط فہمیاں ہیں - ہم لوگ برے نہیں ہوتے ، کمینے اور ذلیل نہیں ہوتے ، آوارہ اور بدمعاش نہیں ہوتے ، شرابی اور جوئے باز نہیں ہوتے ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہم غریب ہیں - اور ہمارے پاس رہنے کے لیے اچھا مکان نہیں - محض اس وجہ سے ہم پر تمام تہمتیں لگائی جاتی ہیں - آپ یہاں رہیں گی تو پتہ چل جائے گا - کہ ہم لوگ کیسے ہیں ۔ "

" ٹھیک ہے ٹھیک ہے" بڑی کو حامد علی سے وحشت ہونے لگی ۔" وہ شاہ والی سوسائٹی کہاں ہے اس نے جلدی سے پوچھا۔

چلئے دکھا دیتے ہیں ۔

اتنا کہہ کر حامد علی چلنے لگا۔ وہ واقعی جھجک رہا تھا۔ پیچھے پیچھے یہ لوگ بھی چلنے لگے ۔

حامد علی نے کہا۔

" کچھ لوگ یہاں بھی برے ضرور ہیں۔ لیکن ایسے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ اونچی سوسائٹی میں برائی بھی اونچی ہوتی ہے ۔ فرق اتنا ہے کہ انھیں قانون اپنے سائے میں لئے رہتا ہے اور ہم غریبوں کو اپنے شکنجے میں دبائے رہتا ہے ۔ اس لیے ہم ہر جگہ پر برے ثابت ہو جاتے ہیں ۔"

چلتے چلتے وہ ایک طرف مڑ گیا ۔

" آیئے اس ڈھلوان کے بعد وہ سوسائٹی شروع ہو جاتی ہے" اس نے کہا۔

یہاں زمین اوبڑ کھابڑ تھی ۔ روحیلہ کی اونچی ایڑی کی سینڈل ابھری ہوئی دو اینٹوں کے درمیان پھنس گئی ۔ اس نے زور لگایا تو ایڑی دونوں اینٹوں کے درمیان جوں کی توں پھنسی رہ گئی۔ البتہ سینڈل باہر نکل آئی ۔ اور اب وہ بھی اسی طرح جھجک کر چل رہی تھی جس طرح حامد علی چل رہا تھا

ڈھلوان کے قدموں میں شاہ زمانی سوسائٹی تھی۔ حامد علی نے ان لوگوں کی رہنمائی مکان تک کی۔ بڑی نے اپنا پرس کھول کر اطمینان کر لیا تھا۔ کہ اس میں چھوٹی نوٹیں موجود ہیں۔ وہ حامد علی کی خدمات کے صلے میں اسے

کچھ دینے کا ارادہ کر چکی تھی ۔ حامد علی کی باتوں سے اسے بڑی الجھن ہوئی تھی وہ چاہتی تھی کہ وہ جلد از جلد دفع ہو جائے ۔ اور اس کی بک بک سے اسے نجات ملے ۔ وہ تھک گئی تھی ، اسے بھوک بھی لگ رہی تھی ۔ اس گھر میں تو کچھ تھا نہیں اور اس پچھڑے علاقے میں کوئی ڈھنگ کی چیز ملنے کے امکانات بھی نہ تھے ۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا ۔

انور صاحب نے دروازہ کھولا ۔ حامد علی باہر کھڑا رہا ۔ بڑی نے اپنا پرس کھولا اور پانچ روپے کا ایک نوٹ نکال کر حامد کی طرف بڑھایا ۔

یہ لو تمہارا نذرانہ

حامد سکتہ میں آگیا ۔ لیکن اس نے فوراً اپنے کو سنبھال لیا ۔ اس نے روپیہ لے لیا اور کچھ بولے بغیر چلا گیا ۔ انور صاحب ، بڑی اور روحیلہ اندر داخل ہوئے تین کمروں کا آراستہ مکان تھا ۔ سب کو پسند آیا ۔ وہ تینوں ڈرائنگ روم میں پھیل کر بیٹھ گئے ۔ انور صاحب صوفہ پر لیٹتے ہوئے بولے حامد علی کو دیکھ کر مجھے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا ۔ تب میں بہت چھوٹا تھا ۔ ایک بار ہم کہیں باہر جا رہے تھے ۔ اسٹیشن پر چھوڑنے ابا حضور کے ایک دوست بھی آئے تھے وہ ہمیں رہ رہ کر لپٹا رہے تھے اور بار بار دعائیں دے رہے تھے ۔ گاڑی چلی تو وہ بڑی حسرت سے ہمیں دیکھ رہے لگے ۔ میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی ۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے لیے کیا کروں کچھ اور نہ سوجھا تو جیب سے ایک روپیہ نکالا اور ان کی طرف پھینکتے ہوئے بولا ۔

" چچا جان حلوہ کھا لیجئے گا ۔

اس کے بعد چچا جان جب بھی ہمارے گھر آتے مجھ سے کہتے بیٹے حلوہ نہیں کھلاؤ گے ۔ اور میں شرم سے کٹ کٹ جاتا یہ تو مجھے اسی دن ابا حضور نے بتا دیا تھا کہ وہ شہر کے بہت بڑے رئیس تھے ۔

روحیلہ زور سے ہنس پڑی لیکن بڑی کا چہرہ غصہ سے سرخ ہوگیا۔ بولی ۔

آپ کو اس علاقہ میں آ کر بار بار اپنا بچپن کیوں یاد آ رہا ہے اپنی مٹی کی بو سونگھ لی ہے ۔ کیا ۔ کچھ کھانے پینے کا بندوبست کریں گے یا آج کی رات فاقے ہی ہوں گے ۔

اس وقت حامد علی دوبارہ حاضر ہوا ۔ اس بار اس کے ساتھ کچھ دوسرے نوجوان تھے ۔ اور چند عورتیں بھی جن کے ہاتھوں میں کھانے کے تھال اور پانی کے گھڑے تھے ۔

حامد علی نے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا ۔ آپ لوگ نہا دھو کر تازہ دم ہو لیں ۔ ہماری عورتوں نے آپ لوگوں کے لیے کھانا تیار کیا تھا وہ لے کر حاضر ہوئی ہیں ۔ آپ لوگ کھانا کھا لیں ۔ اس کے بعد ضرورت کی ساری چیزیں ہم لا دیں گے ۔ ہماری کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ کم از کم ایک ہفتہ تک آپ ہمارے مہمان رہیں گے ۔ بیگم صاحبہ نے مجھے پانچ روپئے دئے تھے میں نے اس سے درگاہ شریف پر آپ لوگوں کی نیاز اتار دی ہے ۔

بڑی نے گھبرا کر کہا ۔ لیکن وہ روپیہ تو ہم نے تمہیں دیا تھا ۔

اس سے پہلے کہ حامد علی کچھ کہتا انور صاحب کھڑے ہو گئے ۔ وہ اپنی

بیگم کے پاس گئے اور بولے ۔

تمہاری اس ذلیل حرکت سے مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آگیا ۔

" شٹ اپ " بڑی نے انہیں زور سے ڈانٹا ۔

اس پر روحیلہ جھٹکے سے اٹھی اور اپنے باپ سے آکر لپٹ گئی ۔

" ابا حضور مجھے سنائیے ۔ میں سب کچھ سننا چاہتی ہوں "

" کیا کہا تم نے مجھے ابا حضور ! "

" ہاں اور یہی ٹھیک بھی ہے ۔ میں آپ کے بچپن میں لوٹنا چاہتی ہوں ۔ ابا حضور بڑی تو بہت آگے نکل گئی ہیں ۔ "

اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔

مدرسے سے قبر تک

گاؤں کے باہر ایک مسجد تھی۔ جس کے صحن میں نیم کا ایک گھنا درخت تھا اور اس درخت کے نیچے ایک پختہ چبوترہ تھا۔ یہ گاؤں کا مدرسہ تھا اسی پر چھوٹے چھوٹے لڑکے سروں پر ٹیڑھی میڑھی، کچھ صاف کچھ میلی ٹوپیاں اوڑھے اور کمسن لڑکیاں دوپٹوں سے اپنے سروں کو منڈھے جھوم جھوم کر سپارے پڑھ رہے تھے۔ مولوی صاحب جو مسجد کے امام بھی تھے۔ نیم غنودگی کے عالم میں درخت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ انھیں سوتا سمجھ کر بچوں نے آواز مدھم کردی۔ مگر مولوی صاحب سوئے کہاں تھے۔ وہ تو بس اونگھ رہے تھے۔ کانوں پر آواز کی ضرب ہلکی پڑی تو انہوں نے چپکے سے آنکھیں کھولیں اور اپنے شاگردوں کو گھورا۔ مولوی صاحب کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے سرخ ڈوروں کی گرفت میں بچوں کی روحیں آگئیں۔ اور وہ زور زور سے

پڑھنے لگے۔ مولوی صاحب نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔
چند منٹوں بعد بچوں کی آوازیں دوبارہ کمزور پڑیں تو انہوں نے شاطرانہ ادا سے آنکھیں کھولیں۔ پاس رکھی چھڑی اٹھائی اور اسے فرش پر دے مارا۔

"سپارے بند کرو اور اردو کی کتاب نکالو"۔

انھوں نے حکم دیا۔ تمام بچوں نے جھٹ پٹ سپارے بند کردئے۔ رحل سمیٹ کر ایک طرف رکھدی۔ اور اپنی اپنی تھیلیاں ٹٹول ٹٹول کر اردو کی کتاب نکالی۔ مولوی صاحب نے سب کو باری باری دیکھا اور جب انھیں یقین ہوگیا کہ ہر بچہ ان کے وجود کے احساس سے دب کر، سہم کر، گردنیں جھکائے، ہاتھوں میں کتاب تھامے اپنی زندگی سے عاجز ہوچکا ہے۔ تو انھیں اطمینان ہوگیا۔ اور انھوں نے آنکھیں دوبارہ بند کرلیں اور اپنے عزیز شاگرد سے بولے۔

"جابر آج کا سبق یاد کراؤ"۔

مولوی صاحب کے قریب بیٹھا جابر اچھل کر کھڑا ہوگیا اس نے اپنی دوپلی ٹوپی ذرا سی کج کی آنکھوں میں اپنے استاد کی کرختگی، چہرے پر خشونت طاری کرلی۔ اس نے دونوں ہونٹ سکوڑ لئے۔ اور گردن تان کر مولوی صاحب کی چھڑی اٹھالی۔ تمام ننھے منے بچوں کے جسموں میں زلزلہ آگیا ایسا زلزلہ جس سے زمین پھٹتی تو نہیں، آتش فشاں پہاڑ ابلتا تو نہیں مگر زمین دہل ضرور جاتی ہے۔ ان کے نرم اور ملائم اجسام کانپنے لگے۔

اور نازک دل تیزی سے دھک دھک کرنے لگے۔

جابر نے بچوں پر طائرانہ نظر ڈالی۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ اور وہ اپنی اپنی کتابیں کھولے آنے والے لمحے کا دھڑکتے دلوں سے انتظار کر رہے تھے۔

جابر کو جب اطمینان ہوگیا کہ وہ ہر ایک کے حواس پر چھا چکا ہے اور سارے بچے اپنی اپنی قبروں میں گھس چکے ہیں تو اس نے اپنے چہرے پر کرختگی کچھ زیادہ ہی کرلی اور حکم دیا۔

"عذابِ قبر والا سبق نکالو!"

بچوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ مدرسے میں داخل ہونے کے بعد ان کے چہروں پر جو تھوڑی بہت شگفتگی باقی رہ گئی تھی وہ بھی کافور ہوگئی۔ جلدی جلدی سبھوں نے قبر والا سبق نکال لیا۔

"پہلے میری بات ہوگی۔ پھر سبق"

اتنا کہہ کر جابر نے قریب بیٹھی ایک بچّی کے سر پر مولوی صاحب والا ڈنڈا مار دیا۔ وہ بیچاری سی کہہ کر رہ گئی۔

"یہ تو آخرت والا سبق ہے۔ قبر والا نکال"

جابر نے دوسری مرتبہ لڑکی کو پیٹ دیا۔ وہ مجبوراً اس بار بھی "سی" کہہ کر رہ گئی۔ اور جلدی سے قبر والا سبق نکالی۔ جابر نے قہر آلود نگاہوں سے تمام بچوں کو دیکھا جن کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور نگاہیں کتاب پر مرکوز تھیں اس نے کھنکھار کر گلہ صاف کیا۔ ٹوپی ٹھیک کی اور کہنا شروع کیا۔

"تم آج نہیں تو کل مرو گے۔ پھر قبر تمہارا مسکن ہوگا۔ منکر نکیر سوال کریں گے جو ایمان والے ہوں گے وہ جواب صحیح دیں گے اور جو گنہ گار ہوں گے وہ گڑبڑا جائیں گے۔ کچھ کا کچھ کہہ جائیں گے۔ پھر وہ چلے جائیں گے تو گناہگاروں کی قبریں سکڑنے لگیں گی۔ اور سکڑتے سکڑتے اتنی تنگ ہو جائیں گی کر مردے کی ہڈیاں چٹخنے لگیں گی۔ چٹ، چٹ، چٹ۔"

جابر نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پیوست کر دیا اور انھیں مروڑنے لگا۔ انگلیاں ٹوٹنے لگیں۔

"اسی طرح تمہاری ہڈیاں ٹوٹیں گی۔ یعنی گناہگاروں کی ہڈیاں ٹوٹیں گی۔ پھر قبریں اپنی اصلی حالت پہ آجائیں گی۔ اور یہ عمل جاری رہیگا قیامت کے دن تک۔"

جابر نے ہونٹ سکوڑ کر موت کے شکنجے میں جکڑے ہوئے بچوں کو دیکھا جن کے بھولے بھالے چہروں پر آدھی رات کی سیاہی پھیل گئی تھی۔ چند سیکنڈ تک وہ فاتحانہ انداز میں سر ہلاتا رہا۔ پھر بولا۔

"وہاں بالکل اندھیرا ہوگا، روشنی کی ایک کرن بھی نہ ہوگی نہ ہوا کا دخل ہوگا نہ پانی کا گذر۔ دانا ہوگا نہ کھانا۔ دوست ہوں گے نہ عزیز، دنیا کی تمام آرائشوں اور مسرتوں سے بے بہرہ گناہ گار مردہ تنہا قبر کی کوٹھری میں پڑا مختلف الاقسام کیڑے مکوڑوں، سانپ بچھوؤں کی صحبت میں اپنے مقدر کو روتا ہوگا اور......"

یکایک جابر چپ ہوگیا۔ اس نے گھور کر ایک لڑکے کو دیکھا

۔ جو بڑے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ سارے بچوں کے چہروں سے رونق اڑ گئی تھی۔ سبھی دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ قبر کے عذاب کو سن کر سب کے سب اپنی زندگی سے بیزار لگنے لگے تھے۔ بہتوں کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ اور کئی ایک تو سسکنے بھی لگے تھے۔

مگر وہ لڑکا اطمینان سے بیٹھا رہا۔ جابر کو حیرت ہوئی۔ اس کی تقریر سے تو مولوی صاحب تک استغفراللہ کہہ اٹھتے تھے، اور بڑے بڑوں کے چہرے بے نور ہو جایا کرتے تھے۔ مگر یہ لڑکا تھا کہ بیٹھا ٹکر ٹکر اسے دیکھے جا رہا تھا اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ حد ہو گئی تھی۔

جابر کندھوں سے جھک گیا اور چھڑی ٹیکتا ہوا اس لڑکے کی طرف اس انداز سے بڑھنے لگا جیسے شیر اپنے شکار پر حملہ آور ہونے والا ہو۔ لڑکے کے پاس پہنچ کر اس نے چھڑی کا آخری سرا اس کے کندھے پر رکھ کر زور سے دبا دیا اور پوچھا۔

"کیا نام ہے تیرا؟"

"رحمت علی، لڑکا جلدی سے بولا۔

"ہوں، تجھے ڈر نہیں لگتا مردود"

اس نے رحمت علی کے سر پر چھڑی مار دی۔ مگر رحمت علی کچھ نہ بولا "سی" بھی نہ کیا۔ جابر کا غصہ اور بڑھ گیا۔ اس نے گرج کر پوچھا۔

"بولتا کیوں نہیں"

"آج یہ پہلی بار مدرسے آیا ہے۔" کسی نے بتایا۔

"ہوں، تبھی آداب سے واقف نہیں۔" مولوی صاحب بول پڑے۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔ ورنہ ممکن ہی نہ تھا کہ اس کے مدرسے میں دو چار دن بھی جو ٹک جاتا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور زندگی کا شائبہ تک باقی رہ جاتا۔

جابر نے رحمت علی کو دھکا دے دیا

"دفع ہو جا یہاں سے شیطان"

رحمت علی نے جلدی سے اپنا بستہ سنبھالا اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔

راستے میں اسے بے تحاشہ دوڑتے ہوئے دیکھ کر کسی نے پوچھا۔

کیوں رحمتوا کہاں سے بھاگا ہوا آ رہا ہے۔؟

"قبر سے"

رحمت علی نے بوکھلا کر کہا اور رفتار تیز کر دی۔

بارش کا نزول

ان لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو۔ اس میں چمک ہو، کڑک ہو، اور یہ کڑک کی وجہ سے موت کی ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسے لے رہے ہوں۔ یہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت پر گمراہی کو ترجیح دی تو ان کی تجارت ان کے لئے نفع بخش نہ ہوئی اور یہ ہدایت پانے والے نہ بنے۔" (سورہ بقرہ)

ان چاروں نے ریگستان میں خیمہ گاڑ کر طنابیں کھینچ دی تھیں اور لب منہ اٹھائے آسمان کو تک رہے تھے۔

کیا دیکھ رہے ہو؟" چوتھے نے پہلے سے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

وہی جو دوسرا دیکھ رہا ہے۔

" مگر میں تو کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہا ہوں۔ دوسرے نے صفائی پیش کر دی لیکن آسمان کو تکنا بند نہیں کیا۔

" تو میں وہ دیکھ رہا ہوں جو یہ دیکھ رہا ہے "۔

پہلے نے تیسرے کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر تیسرا گھبرا کر بولا ــــ " یہ جھوٹ ہے مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔

ان کی باتیں سنکر چوتھا بولا۔

" تم تینوں اندھے ہو۔ مجھے تو بادل کا ٹکڑا نظر آنے لگا ہے "۔

اس انکشاف پر باقی تینوں دوڑ کر چوتھے سے لپٹ گئے۔ " تو تم نے دیکھ لیا؟ " انھوں نے ایک زبان ہو کر پوچھا۔

اپنی نگاہیں آسمان سے ہٹائے بغیر چوتھے نے جواب دیا ــــ "

ہاں میں نے دیکھ لیا۔ میں نے کہا تھا نا ایک دن بارش ہو کر رہے گی۔"

" مگر جب ہم چلے تھے تو آسمان صاف تھا اور اب بادل کا یہ ٹکڑا کہاں سے آگیا " پہلے نے حیرت سے کہا۔

چوتھا آسمان پر نگاہیں بدستور جمائے ہوئے بولا۔

" میں نے زائچہ دیکھا تھا اسی طرح جس طرح ہمارے اجداد نے دیکھا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ ایک دن آئے گا جب بارش ہو گی اسی طرح جس طرح ہمارے اجداد کو معلوم تھا۔ اور وہ دن شاید آگیا۔"

" لیکن تم ڈر کیوں رہے ہو ہم نے تو خیمہ گاڑ لیا ہے " دوسرے نے ہمت بندھانے کے لئے کہا۔ حالانکہ اس کے چہرے کا رنگ خود ہی اڑ گیا تھا۔

" دوسرے کی بات سن کر چوتھا بولا،

یہ تو ٹھیک ہے، کہ ہم نے خیمہ گاڑ لیا۔

لیکن بارش مسلسل ہو گی اور ہمارا خیمہ اکھڑ جائے گا یہ ہمیں معلوم ہے اسی طرح جس طرح ہم سے پہلے آتے والوں کو معلوم تھا۔ کہ ایک دن آئے گا جب بارش ہو گی اور ہمارا خیمہ اکھڑ جائے گا اور پھر بارش کا پانی ریگستانوں میں بہتا ہوا سمندر میں گرے گا اور سمندر کے پانیوں سے ہم آغوش ہوتا ہوا امیدالوں میں جائے گا اور وہاں سے پہاڑوں پر چڑھ دوڑے گا۔"

چوتھا خاموش ہو گیا اور باقی تینوں کو دیکھنے لگا جو اس کی بات سن کر تھر تھرانے لگے تھے۔

" ارے تم تو ڈر گئے۔" اس نے پہلے کو ہلایا۔ اس پر پہلا خفت مٹاتے ہوئے بولا۔ ڈرنے کی کیا بات ہے بادل کا ٹکڑا بہت چھوٹا ہے یہ پورے ریگستان پر کیسے چھا سکے گا۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس خیمہ جو ہے۔"

اس پر چوتھا بولا

" مگر ہمارا زائچہ غلط کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم سے پہلے گزرنے والوں نے ہمیں خبر دار کیا ہے ایک دن بارش ضرور ہو گی اور بجلی کڑکے گی اور ہمارے خیمہ کو معہ ہمارے جسموں کے جلا کر خاک کر دے گی۔

چوتھے کی بات سن کر دوسرا بول اٹھا۔

" لیکن ابھی تو بادل کا ٹکڑا محض ایک پرندے کی طرح اڑ رہا ہے۔ کل صبح دیکھیں گے اب چلو خیمے میں آرام کریں کہ ہم چرواہوں کی ڈرپوک اولاد نہیں۔ ہم نے اپنے خداؤں کو کبھی ناراض نہیں کیا۔"

وہ سب خیمے میں جا کر اپنی اپنی گدڑیوں میں دبک گئے اور سونے کی کوشش

کرنے لگے ۔ لیکن نیند کسی کو نہ آئی ۔ تھوڑی دیر بعد چوتھے نے پکارا ۔

" تم لوگ سو گئے کیا ؟ "

" نہیں تو باقی تینوں ایک ساتھ بولے

میں تم لوگوں کو ایک ترکیب بتاتا ہوں ۔ " چوتھے نے کہنا شروع کیا ۔ وہ یہ کہ جب بارش شروع ہو تو ہم خیمے سے باہر نکل پڑیں اور بھیگ جائیں کر بھیگے جسموں کو بجلی نہ جلا پائے گی ۔ "

چوتھے کی بات سن کر باقی تینوں ہنسنے لگے

" تمہاری عقل ماری گئی ہے ۔ " تیسرے نے چوتھے کا مذاق اڑایا ۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم خاموش ہو جائیں اور اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر آنکھیں بند کر لیں اس طرح بجلی کی کڑک ہمارے اعصاب کو تکلیف نہ دے گی ۔ اور روشنی سے ہماری آنکھیں اندھی نہ ہوں گی اور ہم نیند کی آغوش میں چلے جائیں گے اور جب اٹھیں گے تو مطلع صاف ہوگا ۔

تیسرے نے اپنی بات ختم کی تو پہلے نے پوچھا ۔

" اگر طوفان آجائے تو ۔ " اس پر چوتھے نے کہا

طوفان کی بات ہمارے اجداد نے نہیں بتائی ہے صرف اتنا بتایا ہے کہ بارش ہوگی اور پانی پھیلتا جائے گا وہ ریگستانوں سے نکل کر سمندروں کو روندے گا ۔ وہاں سے نکل کر میدانوں میں جائے گا اور دیکھتے دیکھتے مشرق مغرب شمال جنوب سیراب ہو جائیں گے ۔ اور ہم میں جو بھیگے گا بجلی اسے جلا نہ پائے گی ۔ اور جو خیمے میں چھپا رہے گا اس کے اعصاب پر بجلی گرے گی ۔

چوتھا اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ پہلے نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔

"تم بیوقوف ہو۔ بجلی کو اگر گرنا ہوگا تو باہر گرے گی پورا ریگستان چھوڑ کر وہ ہمارے خیمے پر کیوں گرنے لگی۔

"لیکن ہمارے زائچے غلط نہیں ہو سکتے۔"

چوتھا اپنی بات پر اڑا رہا۔ ہمیں اپنے اجداد کے قول کی صداقت پر شبہ نہیں انھوں نے بتایا ہے کہ بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوگا۔ وہ دیکھتے دیکھتے پورے ریگستان پر چھا جائے گا، اور پھر بارش ہوگی اور بارش کا پانی ریگستانوں کو سیراب کرتا ہوا سمندروں کے سینوں پر دندناتا ہوا میدانوں میں جا گرے گا۔

"تم کتنی بار وہی بات دہراؤ گے۔" تیسرا عاجز آکر بولا۔

"اچھا تو تم تینوں سو جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں۔"

چوتھے نے مشورہ دیا۔ اس پر دوسرا خفا ہوگیا۔

"بیوقوف نہ بناؤ۔ ہم سو جائیں اور جب بارش ہو تو تم چپکے سے باہر چلے جاؤ اور بھیگ جاؤ اور ہمارے خیمے پر بجلی گرے اور ہم خاک ہو جائیں

"تو تم لوگ جاگو۔ میں سو جاؤں۔" چوتھے نے ایک اور مشورہ دیا

اس پر پہلا ہنس پڑا

"اب یہ تو اور زیادہ حماقت ہوگی کہ ہم جاگتے رہیں اور تم مزے میں سوتے رہو اور آخر میں پتہ چلے کہ کہیں کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ پانی برسا نہ بجلی گری

اب چوتھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔" مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے۔ اس نے بڑی متانت سے کہا۔" ہمارے اجداد نے پیشین گوئی کی ہے کہ آسمان میں

، بادل کا ٹکڑا نمودار ہوگا، پھر وہ پھیلتا جائے گا، اور صحرا پر چھا جائے گا۔ پھر بارش ہوگی اور پانی ریگستانوں سے بہتا ہوا سمندروں میں چھلانگ لگا دے گا اور ۔۔۔

چوتھا اپنی بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ تیسرے نے اسے پھر جھڑک لیا۔ " تم پاگل ہو گئے ہو کیا کب تک ایک ہی رٹ لگاتے رہو گے ۔ تیسرے کی بات سن کر چوتھے نے اپنے کندھے اچکائے ۔ پھر بولا ۔

" تم لوگ میری بات سنو ۔ میں نے زائچہ خود دیکھا ہے ۔" اچھا کہو تینوں ایک ساتھ بولے اور اپنی اپنی گدڑیوں سے نکل آئے ۔ تب چوتھے نے کہنا شروع کیا ۔

" جب بارش ہونے لگے تو ہم لوگ اپنے خیمے اکھاڑ دیں اور خود کو کھلی فضا میں ڈال دیں کہ باہر بارش ہوتی رہے گی اور بجلیوں کا ڈر نہ ہوگا کہ بجلیاں بھیگے جسم پر اثر نہ کریں گی وہ تو خشک جسموں کی ہی متلاشی ہوں گی ۔ یہ خیمے ہمارے کس کام کے ۔"

چوتھے نے اپنی بات ختم کی تو پہلا زور سے ہنس پڑا ، باقی تینوں چونک کر اسے دیکھنے لگے ۔

" کیا تمہیں ڈر نہیں لگ رہا ہے ؟" دوسرے نے پوچھا ۔ " نہیں" پہلے نے جواب دیا ۔

" کیوں " دوسرے اور تیسرے نے ایک ساتھ پوچھا ۔ تو پہلے نے بتایا ۔

"سفر پر روانہ ہوتے وقت میں نے اپنی جھولی میں ایک خدا رکھ لیا تھا وہ میری حفاظت کرے گا۔

اس کی بات سن کر دوسرا بھی ہنسنے لگا

"یہ مجھے بیوقوف سمجھتا ہے نہیں جانتا کہ میں نے بھی ایک خدا اپنی گدڑی میں چھپا رکھا ہے"

دوسرے کی بات سن کر تیسرا بھی قہقہہ لگانے لگا۔

"تم دونوں ہی عقلمند نہیں" میں نے بھی اپنی اندرونی جیب میں ایک خدا رکھ چھوڑا ہے۔"

ان تینوں کی بات سن کر چوتھا مایوس ہو گیا

" میرے پاس تو کوئی خدا نہیں، اب میری حفاظت کون کرے گا؟" وہ رونے لگا۔ اس پر باقی تینوں نے اسے چپ کرایا کہ وہ اپنے اپنے خداؤں سے اس کی سفارش کر دیں گے۔

چوتھا چپ ہوا تو ان سب نے طے کیا کہ سونا چاہیئے اور جب یہ طے پایا کہ سونا چاہیئے تو چوتھے نے مشورہ دیا کہ سونے سے پہلے ایک بار جا کر دیکھ لینا چاہیئے کہ بادل کتنا بڑھ گیا ہے۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ باقی تینوں چوتھے کی رائے سے متفق ہو گئے۔

اس پر چوتھا اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر گیا مگر دوسرے ہی لمحے چیخ مارتا ہوا خیمے کے اندر گھس آیا۔

"کیا ہوا؟" باقی تینوں نے گھبرا کر پوچھا

"بادل پورے ریگستان پر پھیل چکا ہے اب تو بارش ضرور ہوگی۔ اور پانی ریگستانوں سے گزرتا ہوا سمندروں میں گرے گا اور پھر میدانوں سے ہوتا ہوا..."

"بکواس بند کرو" تیسرے نے زور سے ڈانٹا تو چوتھے نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ چند لمحے سکوت کی نذر ہو گئے۔ پھر دوسرا بولا۔

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ صحرا اجالوں کے نزغے میں آگیا ہے۔ کیا تم لوگوں کو ایسا نہیں لگتا۔"

"تم دونوں ٹھیک کہتے ہو" تیسرے نے بھی تائید کی۔

— "مگر ایسا کیوں ہے؟ بادل گھرنے سے اندھیرا بڑھ جانا چاہیئے"

"یہ سفید بادل ہیں۔ چوتھے نے بتایا — "ہم سے پہلے گزرنے والوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ بادل سفید ہوں گے مگر پانی سے بھرے ہوں گے اور بارش شدید ہوگی اور پانی ریگستانوں سے گزرتا ہوا ...."

"یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔" تیسرے نے حقارت سے کہا — بار بار وہی بات کہہ رہا ہے اس کا اعتماد ہمارے خداؤں سے اٹھ گیا ہے ورنہ اس کی جھولی میں بھی کوئی خدا موجود ہوتا اور یہ قابو میں ہوتا۔"

تیسرے کی بات سن کر چوتھا سوچ میں پڑ گیا اتنے میں زور سے بجلی تڑکی چاروں منہ کے بل زمین پر لیٹ گئے۔ چند ساعتوں بعد چوتھا بیٹھتے ہوئے بولا۔

— میں باہر جا کر دیکھتا ہوں کہیں بارش شروع تو نہیں ہو گئی۔

"خبردار" باقی تینوں نے اسے پکڑ لیا۔

"اچھا تو میں خیمے کے سوراخ سے جھانک کر دیکھتا ہوں۔

اتنا کہہ کر چوتھا ایک جھٹکے کے ساتھ تینوں کی گرفت سے آزاد ہوگیا اور خیمے کی دیوار کے پاس پہونچ گیا اس نے پردے میں ایک سوراخ تلاش کرلیا۔ اور اس پر اپنی ایک آنکھ لگا کر باہر جھانکنے لگا۔ دفعتاً وہ فرطِ مسرت سے چیخ اٹھا
ارے پورا ریگستان تر و تازہ ہوگیا۔ بارش برستی جارہی ہے۔ تم لوگ ذرا سوراخ کے قریب آؤ اور دیکھو کہ کیسی فرحت بخش ہوا چل رہی ہے"۔
"نہیں" باقی تینوں نے سہم کر کہا اور ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ چوتھے نے سوراخ کو پھاڑ کر بڑا کردیا اور اپنی ناک اس کے اندر ڈال کر گہری گہری سانس لینے لگا وہ خیمے سے چپک گیا تھا۔
باقی تینوں تھر تھراتے لگے انھوں نے جلدی جلدی اپنے خداؤں کو ان کی پناہ گاہوں سے باہر نکالا اور انھیں سینوں سے لگا کر گڑ گڑاتے ہوئے نجات کی بھیک مانگنے لگے۔
چوتھے نے سوراخ کو کشادہ کردیا اور پورا سر باہر نکال کر مسرت سے چلانے لگا۔
ارے تم تینوں آکر دیکھو کتنا دلفریب منظر ہے، کیسی سوندھی سوندھی مہک زمین سے اٹھ رہی ہے، پورا ریگستان بیدار ہوگیا ہے، چپہ چپہ سیراب ہوگیا ہے"
وہ تینوں اپنے اپنے خداؤں کو اپنی پیشانیوں سے رگڑنے لگے اور چیخنے لگے۔
"اے خدا ہمیں بجلی سے محفوظ رکھ" انہوں نے اپنے سروں کو ایک دوسرے سے جوڑ لیا اور آنکھیں بند کرلیں۔
اسی وقت بجلی پھر تڑکی۔

چوتھے نے خیمے کا سوراخ اور بڑھا دیا۔ اور آدھا دھڑ باہر نکال کر چیخنے لگا

" ذرا دیکھو تو جب بجلی چمکتی ہے تو پورا ریگستان روشن ہو جاتا ہے اور بارش کے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ ارے تم لوگ کتنے بد قسمت ہو کہ اس دلفریب منظر سے محروم ہو۔

باقی تینوں نے اب رونا شروع کر دیا۔

" اے خدا ہم پر رحم کر۔ ہم نے تم میں سے کسی کے ساتھ نافرمانی نہیں کی۔ گرچہ ہمارے اجداد نے بادل کے اس سفید ٹکڑے کا ذکر کیا تھا۔ لیکن ہمیں تمہاری طاقت پر بھروسہ ہے۔ اور ہم نے خیمے گاڑ لئے تھے کہ ہم یہاں بجلی سے محفوظ رہیں گے اب تو ہی حفاظت کرنے والا ہے۔

اسی وقت بجلی اتنی زور سے چمکی کہ ان تینوں کو ایسا لگا جیسے خیمے میں آگ لگ گئی ہو وہ گھبرا کر ایک دوسرے سے گتھ گئے اور اپنے بال نوچنے لگے، اور ہزیان بکنے لگے۔

چوتھے نے خیمے کی چادر پھاڑ ڈالی اور باہر نکل گیا۔ اس کا باہر نکلنا تھا کہ بجلی پھر تڑکی اور ایک شعلہ اسی سوراخ سے اندر داخل ہو گیا۔

وہ تینوں اندر تھے مگر اس طرح کہ نہ اب وہ دیکھ سکتے تھے اور نہ سن سکتے تھے اور نہ بول سکتے تھے کہ صحیفوں میں ان کا ذکر بار بار آیا ہے۔

اور چوتھا باہر کھڑا بارش میں بھیگ رہا تھا اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور بارش کا پانی ریگستانوں کو سیراب کرتا ہوا، سمندروں کی سطح پر اچھلتا ہوا، میدانوں سے گزرتا ہوا، پہاڑوں کو سر کرتا ہوا کرۂ ارض پر پھیل رہا تھا۔

حجِ اکبر

سیدو میاں کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش حج کرنا ابھی باقی رہ گئی تھی۔ ان کی روکھی سوکھی زندگی کی محدود خواہشیں اللہ نے ایک ایک کرکے پوری کردی تھیں۔ جس کے لئے وہ اپنے رب کے بہت شکرگزار تھے۔ دو لڑکیاں تھیں دونوں کی شادیاں شریف گھرانوں میں ہوگئی تھیں۔ ایک بیٹا تھا وہ بھی کھیتی باڑی میں لگ گیا تھا۔ بیوی کئی سال پہلے انہیں ساری ذمّہ داریوں سے نجات دے گئی تھی۔ وہ اب اپنے وجود ہی میں کھو کر رہ گئے تھے۔ زیادہ وقت اللہ کی عبادت میں گذارتے۔ اور باقی اوقات میں سڑک کے کنارے اسکول کے پاس خوانچہ لگا کر بیٹھے رہتے اور اسکول کے بچوں کو کھٹی میٹھی گولیاں، گراری لیا، چاکلیٹ، اور پتنگ کی ڈور وغیرہ

بیچا کرتے۔ ان ننھے منے گراہکوں کے علاوہ سڑک کی مرمت کرنے اور بلڈنگیں بنانے والے مزدور بھی کبھی کبھار ان سے کھانے کی چیزیں خرید لیتے اور جب کوئی گراہک نہ ہوتا تو سید و میاں ایک ہاتھ سے خوانچہ پر منڈلاتی مکھیاں ہانکتے رہتے۔ اور دوسرے سے تسبیح ہلاتے رہتے۔ کبھی کبھار ادھر سے گزرتا ہوا کوئی پوچھ لیتا سید و میاں کیا حال ہے تو جواب دیتے اللہ کا کرم ہے، زیادہ کٹ گئی تھوڑی باقی ہے۔ اب تو بس یہی آرزو ہے کہ پاک پروردگار اپنے حبیب کے آستاں کی زیارت کرا دے۔

"خدا پورا کرے گا" پوچھنے والا کہتا اور چلا جاتا۔ سید و میاں پھر مکھیاں ہانکنے اور تسبیح ہلانے لگتے۔ پھر کوئی گراہک آجاتا تو وہ رومال کندھے پر رکھ لیتے اور بسم اللہ کہہ کر سامان دیتے اور بسم اللہ کہہ کر پیسے لیتے۔ شام کے وقت جب اسکول بند ہوجاتا تو بچے چیختے چلاتے، دوڑتے بھاگتے اور مزدور اپنے تھکے ہارے جسم کو اپنے پیروں پر اٹھائے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے۔ اسی وقت عصر کی اذان ہوتی سید و میاں اپنا خوانچہ اٹھاتے اور لاٹھی ٹیکتے گھر آجاتے، کرتے کی جیب سے اس دن کی آمدنی نکالتے اسے گنتے اور ٹن کے بکس میں بسم اللہ کہہ کر احتیاط سے رکھ دیتے، اور تالا لگا دیتے، پھر وضو کرتے، اور نماز کے لئے مسجد چلے جاتے۔

یہ سلسلہ سالوں سے چلا آرہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سید و میاں بوڑھے اور کمزور ہوتے چلے جارہے تھے۔ کھیتی کی تھوڑی زمین تھی۔

جسسے بیٹے نے سنبھال لیا تھا۔ اور اپنے بیوی بچوں کا سسٹم سسٹم پیٹ پال رہا تھا
سید و میاں کی دو وقت کی روٹی اور عید بقرا عید کا کپڑا بھی وہ کر دیتا تھا
انھیں اس سے زیادہ چاہیئے بھی کیا تھا۔ کئی بار بیٹے نے سمجھایا بھی کہ بابا
خوانچہ لگانا چھوڑ دو، دن بھر ہلکان ہوتے ہو۔ حج کے لئے جانا چاہتے ہو
تو ایک بیگہ کھیت بیچ ڈالو مگر سید و میاں اپنی ہٹ پر اڑے رہتے ۔
کھیت بیچ ڈالوں گا تو تمہارا کیا ہوگا، تمہاری بیوی بچوں کا کیا ہوگا
میری تو جیسے تیسے کٹ گئی ۔ چار چھ سال زندگی اور بھوگ لوں گا مگر تمہارا کیا ہوگا اتنا کہتے
ہی انکی آنکھوں میں آنسو آجاتا۔ بیٹا بھی خاموش ہوجاتا وہ بھی کیا کرتا۔ باپ
کی خواہش کو وہ مار نہیں سکتا تھا اور پوری کرنے کی اس میں طاقت نہ تھی۔
دو بیگھ کھیت کی اوقات ہی کیا تھی۔ بڑی مشکل سے تو دو وقت کی روکھی
سوکھی روٹی کا انتظام ہو پاتا تھا۔ اس پر بھی سال کے مہینے دو مہینے ساون
بھادوں بھنے ہوئے چنے اور گڑ کے شربت پر گذارا کرنا پڑتا تھا، اور کبھی کبھی
تو بھوکے پیٹ سو رہنا پڑتا تھا۔ کپڑے عید بقرا عید بن جاتے تو بن جاتے
ورنہ تیوہار بھی خالی جاتے ۔ ایسی حالت میں سید و میاں کے حج کے اخراجات
کہاں سے پورے کئے جا سکتے تھے۔ مگر وہ تھے کہ ناممکن کو ممکن بنانے کی
جد و جہد میں سرگرداں تھے۔ وہ خوانچہ لگاتے اور اس سے جو کچھ ملتا جوڑ جوڑ کر
جمع کرتے۔ ٹن کے صندوق میں روپیہ رکھتے وقت انھیں ایسا محسوس
ہوتا جیسے مقاماتِ مقدسہ ان سے تھوڑا قریب ہوگئے، اور ان کی نگاہوں
کے سامنے گنبد خضریٰ آجاتا۔ اور غلافِ کعبہ جھلملانے لگتا۔

ان کے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی اور وہ جلدی سے صندوق بند کر دیتے۔

جب سے لکڑیوں اور بکریوں کا، کاروبار کرنے والے سیٹھ رحمت علی حج کر کے لوٹے تھے سید و میاں ان کی صحبت میں دیر تک بیٹھنے لگے تھے عشا بعد حاجی رحمت علی کی بیٹھک میں محفل جمتی، حقہ آتا، حاجی صاحب تخت پر مسند کے سہارے جلوہ افروز ہوتے اور حقے کی نے منہ میں لگا کر آنکھیں بند کر لیتے چند منٹوں تک وہ متواتر کش پر کش لیتے پھر نے منہ سے نکالتے، ٹوپی سر سے اتار کر ایک طرف کھڑی کر دیتے (حاجی صاحب کی کلف دار چکن کی ٹوپی جہاں بھی رہتی کھڑی ہوئی نظر آتی۔) سر پر ہاتھ پھیرتے، حلق سے اللہ اکبر عجیب و غریب آواز میں نکالتے۔ پھر ارشاد فرماتے۔

"نور برستا ہے نور"

چار پائی پر پیر لٹکائے بیٹھے ہوئے سید و میاں مجسّم گوش بن جاتے ذرا سا جھک کر سیٹھ کے نورانی چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیتے۔

حاجی صاحب عرفات کا میدان کتنا بڑا ہے؟ وہ پوچھتے۔

"بڑا؟ ارے صاحب اللہ کا کرشمہ نظر آتا ہے کرشمہ۔"

اور کتنے آدمی ہوتے ہوں گے؟

آدمی؟ کیا بتاؤں سید و میاں سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، بھانت بھانت کے لوگ، ایرانی بھی، تورانی بھی، مصری بھی، افغانی بھی، افریقی بھی، اور جاپانی بھی، کالے بھی اور گورے بھی چھوٹے بھی اور لمبے بھی۔۔۔۔

" او بھائی ذرا دیکھ کے چل آگے بھی تیچھے بھی "

کوئی مسخرہ گلی میں ہانک لگاتا اور حاجی صاحب کا کلام قطع ہو جاتا ان کی بھویں تن جاتیں ــــ مردود وہ نفرت سے کہتے ، تھوڑی دیر چپ رہتے پھر بولتے ۔ بس کیا بتاؤں حضرت اللہ تعالیٰ کا کرشمہ نظر آتا ہے ۔ کرشمہ "

" سنا ہے ہزاروں آدمی ایک ساتھ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں " کوئی اور پوچھتا اور حاجی صاحب جواب دیتے ۔

" میاں لاکھوں کہو ۔ لاکھوں ۔ ایسا لگتا ہے کہ پوری کائنات گردش کرنے لگی ہو، پورا عالم پروانہ ہو گیا ہو اور شمع کعبہ کے گرد گھوم رہا ہو ــــ مالک حقیقی کا کرشمہ نظر آتا ہے ۔ کرشمہ "

ایک دن سید و میاں نے حاجی صاحب سے ڈرتے ڈرتے پوچھا ــــ حاجی صاحب حج کے لئے کتنے روپئے چاہیئے "

روپئے ؟ حاجی صاحب زور سے ہنس پڑے ــ میاں اتنے کہ تم گن نہیں سکتے ۔ آستانہ بوسی کا شرف تو اسے حاصل ہوتا ہے جس پر اللہ کا کرم ہو ۔ سب کے بس کی بات کہاں ــ کیا سمجھے ؟

" درست فرمایا " ــــ پھر بھی حاجی صاحب آپ کا کیا خرچ ہوا تھا "

" میری بات چھوڑ دو میاں ۔ میں نے کوئی حساب تھوڑی رکھا تھا ۔ پندرہ ہزار بھی ہو گیا ہو، بیس ہزار بھی ۔ "

" مگر لوگوں کا کہنا ہے کہ چھ ہزار میں کام چل سکتا ہے "

" ہاں، ہاں ۔ اگر معمولی طرح سے کام نکالنا ہو تو چل بھی سکتا ہے ۔

وہ جو پانی کے جہاز سے جاتے ہیں اور عام درجوں میں سفر کرتے ہیں۔ وہ اتنے میں کام چلا بھی سکتے ہیں۔ میں تو خیر ہوائی جہاز سے گیا تھا۔ اور وہی جانتا ہوں۔ کیا سمجھے؟

سید و میاں لاٹھی ٹیکتے گھر واپس آگئے ۔ اور سیدھے اپنی کوٹھری میں گئے چراغ کی ٹمٹماتی روشنی میں اپنا صندوق کھولا، تھیلی نکالی، اور روپیہ گننے لگے ایک...... دو...... دس...... سو...... پانچ سو...... ہزار.... پانچ ہزار ...... پانچ سو تریسٹھ"

بس اب پانچ سو باقی رہ گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو اگلے سال پورے ہو جائینگے اور پھر —"

سید و میاں اس سے آگے نہ سوچ سکے۔ صندوق بند کر دیا۔ ایک ہاتھ میں مٹی کے تیل کی ڈبریا پکڑے اور دوسرے سے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کوٹھری سے باہر آگئے۔

عشاء کی نماز ہو چکی تھی۔ حاجی رحمت علی کی بیٹھک میں حسب معمول چہل پہل تھی۔ حاجی صاحب گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ حقہ کی سنہری نے ہونٹوں میں دبائے بڑی ادا سے کش لے رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں وہ اپنی ملائم ملائم انگلیوں سے کبھی چکنے سر کو ہولے ہولے سہلاتے اور کبھی داڑھی میں کنگھی کرتے۔ لکھنوی تمباکو کا دھواں فضا میں تحلیل ہو کر ایک سحر آمیز خوشبو بکھیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد حاجی صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ قریب ہی بیٹھے سید و میاں کو دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کر لیں بولے۔

"سید و میاں، سنا ہے تم حج کرنے جا رہے ہو"

"جی حاجی صاحب" سید و میاں نے کچھ اس طرح بوکھلا کر جواب دیا جیسے وہ کوئی گناہ کرتے جا رہے ہوں۔

اڑتے اڑاتے خبر ہم تک بھی پہونچی تھی۔ کہ حج کی تمنا میں تم بھی جی رہے ہو مگر یہ معلوم نہ تھا کہ تم واقعی حج کرنے جاؤ گے بھی، حیرت ہے"

" اللہ کی مرضی، سیدو میاں نے گھبرا کر کہا۔

" وہ تو ہے، مگر کبھٹی یہ روپئے کہاں سے اکٹھا کر لئے۔

" اللہ نے انتظام کر دیا"

" وہ تو ہے، مگر پانچ چھ ہزار روپئے ؟"

" اللہ اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہے "۔ سیدو میاں کے منہ سے نکلا حاجی صاحب نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

" کوئی کھیت بیچ ڈالا کیا ؟"

" نہیں "۔

" پھر "۔

لیکن اس سے پہلے کہ سیدو میاں جواب دیتے ایک عورت دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ حاجی صاحب نے دیکھا تو پوچھا۔

" کون ؟"

" میں ہوں۔ حاجی صاحب"

" میں ؟ ۔ میں کون ؟"

" عیدو کی بیوہ ہے۔ حاجی صاحب "۔ کسی اور نے بتایا۔

" ہوں کیا ہے ؟"

حاجی صاحب نے پھر آنکھیں بند کرلیں۔

"حاجی صاحب میری بٹیا سلمٰی کی بات پکی ہو گئی ہے۔ آج وہ لوگ آئے تھے مگر۔۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"مگر کیا؟"

"وہ لوگ اگلے مہینے ہی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکا نوکری سے آیا ہوا ہے شادی کرکے جانا چاہتا ہے"

"تو؟"

"ابھی تک کوئی انتظام نہیں ہوا ہے۔ آج اس کے ابا زندہ ہوتے تو۔۔۔

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور سسک سسک کر رونے لگی۔

حاجی صاحب نے آنکھیں کھول دیں، سر سے ٹوپی اتاری، چندیا سہلائی پھر ٹوپی سر پر رکھ لی اور اس عورت کو غور سے دیکھنے لگے۔

سلمٰی کچھ کرتی ورتی ہے۔ انھوں نے پوچھا

عورت نے دوپٹہ سے اپنے آنسو خشک کئے۔ بولی

"گھر پر ہی رہتی ہے۔ سیانی لڑکی کو کہاں بھیجوں"

"وہ تو ہے" حاجی صاحب نے جلدی سے کہا۔ پھر بولے

۔۔۔" میرا مطلب تھا کسی شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی تو کچھ سلیقہ ولیقہ سیکھ جاتی۔ تعلیم نہ سہی طور طریقہ تو آجاتا۔

عورت خاموش رہی۔ تھوڑے وقفے سے حاجی صاحب پھر بولے

"کہیں کوئی شریف گھرانہ نہ ملے تو ہمارے یہاں ہی کر جاؤ۔

کچھ دن ہماری لڑکیوں کے ساتھ رہے گی تو انسان بن جائے گی۔
۔ کیا سمجھیں ؟"

"جی" عورت نے دھیرے سے کہا۔

"اور شادی کے اخراجات کا انتظام تو اللہ کرے گا۔ وہی مسبب الاسباب ہے ہم اور تم کیا کر سکتے ہیں۔ ہم حقیر بندے ہیں۔ وہی کوئی صورت نکالے گا"
"جی"

"بس جاؤ اور کل اسے بھیج دو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اتنا کہہ کر حاجی صاحب نے حقے کی نے منہ میں لگالی۔ اور پے درپے کئی کش لئے۔ چلم سے چنگاریاں چٹختی ہوئی نکلیں اور فرش پر بکھر گئیں۔ سید و میاں جو ان کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ حاجی صاحب کو غور سے دیکھنے لگے۔ حقہ پینے سے آنکھیں تو لال ہو سکتی ہیں مگر چہرہ ؟ وہ کیوں سرخ ہو گیا تھا۔ دھویں سے پتلیاں مٹیالی تو ہو سکتی ہیں مگر وہ چمکنے کیوں لگیں اور یہ حاجی صاحب بار بار پہلو کیوں بدلنے لگے"

وہ خاموشی سے اٹھ کر چلے آئے۔

اپنے گھر کی چوکھٹ پر بہو کی آواز سے ٹھٹھک گئے

"بچے چیتھڑے لٹکائے چل رہے ہیں، بابا سے کہو کچھ روپئے دیدیں۔ ان کے کپڑے بن جائیں"

"کیا بکتی ہو" بیٹے نے اپنی بیوی کو ڈانٹا۔" سردی، گرمی، برسات کوئی بھی موسم ہو وہ دن بھر خوانچہ لئے سڑک پر بیٹھے رہتے ہیں۔ پائی پائی

جوڑتے ہیں۔ تمہارے بچوں کے کپڑوں کے لئے۔ جب ہم اس لائق نہیں کہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری کر سکیں۔ تو کم از کم انھیں خود تو کر لینے دو۔ ان کی راہ میں حائل تو نہ ہو۔"

"مگر، بچوں کا ننگا پن نہیں دیکھا جاتا۔" بہو بولی ــــ "پیٹ خالی ہے یا بھرا کوئی نہیں دیکھتا مگر جسم سبھی دیکھتے ہیں۔ ویسے باہر نکلی ہوئی ہڈیاں اور اندر گھسی ہوئی آنکھیں پیٹ کی بھی چغلی کھاتی رہتی ہیں ــــ وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

سید و میاں نے اپنے سینے کے بائیں طرف شدت کا درد محسوس کیا۔ وہ دروازہ کا بازو پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اور دھیرے دھیرے سینہ سہلانے لگے تھوڑی دیر بعد جب درد قدرے کم ہوا تو کھنکھارتے ہوئے اندر داخل ہوئے ان کی بہو، جو چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اٹھ کر بیٹھ گئی اور سر پر دوپٹہ ڈال لیا۔ بیٹا تخت پر لیٹا ہی رہا۔ انھوں نے باری باری دونوں کو دیکھا۔ سہ دری میں لٹکی ہوئی لالٹین اتاری اور بھاری بھاری قدم اٹھاتے اپنی کوٹھری میں گئے۔ انھوں نے صندوق کھولا، روپئے کی پوٹلی نکالی اور روپیہ گننے لگے۔ سید و میاں نے یہ حرکت سینکڑوں بار کی تھی مگر اس دفعہ انھیں روپیہ گننے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔ کئی نوٹیں ایک ساتھ گڈمڈ ہو رہی تھیں نوٹوں کو پہچاننے میں بھی وہ دھوکہ کھا رہے تھے۔ دو کی نوٹ ایک اور دس کی نوٹ بیس کی گن جاتے ــــ لالٹین دھواں اگلنے لگی تھی اور بجھنے کے قریب ہو گئی تھی۔ اس کا دھواں آنکھوں میں جلن پیدا کر رہا تھا۔

بڑی مشکلوں سے وہ آخری نوٹ تک پہونچے کل پانچ ہزار نو سو بیاسی روپئے تھے۔ انھوں نے ساری نوٹیں لاپرواہی سے تھیلی میں گھسیڑ دیں اور تھیلی کرتے کی جیب میں رکھ کر اٹھ پڑے۔ صندوق کو یوں ہی کھلا چھوڑ دیا۔ تالا فرش پر پڑا رہا لاٹھی ٹیکتے ایک ہاتھ میں لالٹین لٹکائے وہ باہر آگئے۔ سہ دری میں آتے ہی لالٹین بھبھک کر بجھ گئی۔ انھوں نے پائے کی آڑ میں اسے رکھ دیا اور آنگن میں دیکھنے لگے۔ ان کا بیٹا بھی اٹھ بیٹھا تھا وہ دھیرے دھیرے بہو کی طرف بڑھنے لگے۔ آنگن میں اندھیرا تھا۔ باورچی خانہ میں مٹی کے تیل کا دیا ٹمٹما رہا تھا۔ جنگلے سے چھن چھن کر آتی ہوئی مدھم روشنی چاروں طرف پھیلے اندھیرے کو دور کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ دالان سے آنگن میں اترتے وقت سیدو میاں کا ہاتھ حقے پر پڑا اور وہ الٹ گیا۔ چلم ٹوٹ کر آنگن میں بکھر گئی اور اس سے چند شعلے بھڑک اٹھے۔

دفعتاً سیدو میاں کو حاجی رحمت علی کی لگا ہوں کی چمک یاد آگئی اور ان کے بڑھتے قدم رک گئے انھوں نے اپنے پوتوں اور پوتیوں کو دیکھا جو چیتھڑوں میں لپٹے ادھر ادھر پڑے سو رہے تھے۔ ان کے جسموں سے نکلی ہوئی ہڈیاں سیدو میاں کی آنکھوں میں گھسنے لگیں۔ ان کے رکے قدم اٹھ گئے اور بہو کی طرف بڑھنے لگے مگر اسی وقت راکھ کے ڈھیر سے ایک شعلہ بھڑکا اور انھیں حاجی رحمت علی کا بار بار پہلو بدلنا یاد آگیا۔ ان کے قدم جہاں تھے وہیں دوبارہ جم گئے اور گردن جھک گئی۔

جب کافی دیر ہو گئی اور سیدو میاں اپنی جگہ سے ہلے نہیں تو بہو نے

دھیرے سے پکارا ۔

بابا

سید و میاں کے جسم میں حرکت آگئی ۔ ان کے قدم پھر اٹھے مگر اپنی بہو بیٹے کی طرف نہیں بلکہ باہر کی طرف ۔

عیدو کے دروازے پر پہنچ کر انھوں نے چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ گلی میں سناٹا تھا۔ میونسپلٹی کے لیمپ کی چمنی سیاہ ہو گئی تھی اور اس سے روشنی کے بجائے اندھیرا کھیل رہا تھا۔ رام لال بنئے کی دوکان کے چبوترے پر خارشں زدہ کتا اپنے جسم کو زمین پر رگڑ رہا تھا۔ اس کے منہ سے نکلتی کھک کھک کی آواز چاروں طرف پھیلی خاموشی کو پھاڑ کر فضا میں وحشت پھیلا رہی تھی انھوں نے دھیرے سے دروازے پر دستک دی ۔

تھوڑی دیر میں دروازہ کھلا، ہاتھ میں لالٹین لئے سامنے سلمی کھڑی تھی ۔ سید و میاں نے اسے دیکھا تو دیکھتے رہ گئے ۔ ایڑی سے لے کر چوٹی تک وہ شباب ہی شباب تھی، اس کے بھرے بھرے خوبصورت چہرے، غزالی آنکھیں، گھنی اور لمبی زلفیں، سرخ گالوں اور یاقوتی ہونٹوں سے پھسلتی ہوئی سید و میاں کی نگاہیں جب اوپر نیچے آئیں تو انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے دل کی حرکت بند ہو جائے گی ۔ سلمی نے جلدی سے دوپٹہ ٹھیک کر لیا ۔ بولی "چاچا"

سید و میاں پسینہ پسینہ ہو گئے ۔ ـــ "تمہاری ماں ہے ـــ ؟" انھوں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا ۔

ہاں اندر آئیے "

دونوں اندر آئے، عیدو کی بیوی باورچی خانے سے نکلی اور سید و میاں کو چارپائی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

" کیسے آنا ہوا بھیا ؟ "

سید و میاں نے سلمیٰ کو چور نگاہوں سے دیکھا۔ بولے۔

" میں یہ جاننے چلا آیا تھا کہ تم بٹیا کو حاجی کے یہاں بھیجوگی ؟ "

" ہاں کیوں نہیں۔ اچھے لوگوں میں کچھ دن رہ لے گی تو اس کا پھوہڑپن تو کم ہوگا اس کے علاوہ بھیا حاجی صاحب شادی بیاہ کے خرچ کا بھی کچھ بندوبست کردیں گے۔

" وہ تو ٹھیک ہے مگر...... " سید و میاں کچھ کہتے کہتے رک گئے۔

" مگر کیا بھیا، عیدو کی بیوی نے پوچھا

سید و میاں نے پھر سلمیٰ کو دیکھا، وہ زمین پر اکڑوں بیٹھی لالٹین میں مٹی کا تیل ڈالنے لگی تھی۔ اس کی چوٹی کا آخری سرا زمین کو بوسہ دینے کے لئے لپک رہا تھا۔ غیر شعوری طور پر سید و میاں کی نگاہیں اس کے پھیلے بازو اور اٹھے گھٹنے کے درمیان گھس گئیں۔ انھوں نے گھبرا کر نگاہیں پھیر لیں۔

" وہاں مت بھیجو، انھوں نے دھیرے سے کہا

عیدو کی بیوی حیرت سے انہیں دیکھنے لگی ۔ پوچھا۔

" کیوں ؟ "

بٹیا کی تربیت تو تم نے ایسی دی ہے۔ جس پر کوئی بھی لڑکی ناز کر سکتی ہے۔ رہ گیا شادی کا خرچ تو .... "

سید و میاں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی - جیب سے روپئے کی پوٹلی نکالی اور اسے چارپائی پر رکھتے ہوئے بولے

" چھ ہزار میں کچھ کم ہیں - پچھلے آٹھ سالوں سے جوڑ جوڑ کر رکھتا آیا تھا ___ حج کے لئے "

عیدو کی بیوی گھبرا کر کھڑی ہو گئی ___ " بھیا وہ چیخی -

" کیا ہوا ؟ " سید و میاں نے اس طرح پوچھا - جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو -

" یہ نہیں ہو سکتا "

" کیوں ؟ "

عیدو کی بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی - تم مجھ پر اتنا بڑا احسان مت کرو

" احسان کیسا ؟ - عیدو میرا دوست تھا - سلمیٰ میری ہی بیٹی ہے - یہ تو میرا فرض ہے -

" مگر تم حج کرنے کس طرح جاؤ گے ___ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی -

سید و میاں گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو گئے -

" حج مجھ پر فرض نہیں "

انھوں نے اطمینان سے کہا - اور چپ چاپ گھر سے باہر نکل گئے۔

●●

ادھورا کام

کریم نے ٹٹول کر کرتے کی ایک جیب سے بیڑی اور دوسری سے ماچس نکالی لیکن بیڑی سلگانے کے لئے جب اس نے ماچس جلانی چاہی تو اسے یاد آیا کہ داہنے ہاتھ کا انگوٹھا تو اس نے کٹوا دیا ہے۔ اس نے ماں کی گالی دی پتہ نہیں یہ گالی اس نے اپنی ماں کو دی تھی یا جمّا کی ماں کو جس نے ورغلا کر اس کا انگوٹھا کٹوا دیا تھا۔ اور مِل سے معاوضہ کے طور پر ۷ ہزار روپئے دلوائے تھے۔ اور خود جمّا نے بیچ سے کمیشن کے تین ہزار روپئے مار دئے تھے۔ جس میں اس کے علاوہ بیمہ کمپنی کا، ڈاکٹر، مِل کا بابو اور انگلی کاٹنے والا سرجن سبھی شریک ہوئے تھے۔ اک ذرا سی "نگرم" سے مل سے دس ہزار روپئے مل

گئے تھے جسے سب نے مل کر بانٹ لیا تھا۔ باقی دوسرے تو بغیر ڈکار لئے ہی ہضم کر گئے تھے۔ کہ ان کا معمول ہی یہی تھا۔ مگر کریم کو انگوٹھا کھونے کا دکھ تھا اس وقت اس نے نفرت سے جما کو یاد کیا ۔

یہ سب اس کمینے، گھوڑی کی اولاد کی وجہ سے ہوا۔ اس نے اسے پھانسا تھا وہ جانتا تھا کہ جما یہی دھندا کرتا ہے۔ کہنے کو تو وہ مل میں کاریگر ہے مگر اس کی کاری گری سانچہ چلانے، کپڑا رنگنے، یا اس پر پالش کرنے میں نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے مزدوروں کا ایکسیڈنٹ کراتے میں ہے اسکے پاس جسم کے ہر عضو کے ریٹ ہیں۔ مجھ سے کہتا تھا کہ بائیں ہاتھ کا انگوٹھا کٹوا دو سرکاری انگوٹھا ہے پندرہ ہزار روپئے مل جائیں گے ۔ مگر وہ تو کہو میں اس کے چکّر میں نہیں آیا ___ مگر آیا کیوں نہیں۔ آ ہی تو گیا تبھی تو داہنے ہاتھ کا انگوٹھا کٹوا بیٹھا اب بیڑی جلانے کے لئے دیا سلائی کو انگلیوں میں پھنسا کر جلانا پڑتا ہے ___ سور کا بچّہ جما۔

اس نے جھک سے ماچس جلائی اور بیڑی کے دو تین لمبے لمبے کش لے کر گذرے واقعات کو ذہن میں تازہ کرنے لگا ۔! سات ہزار روپیوں سے اس نے اپنے گاؤں میں دو بیگھ کھیت خرید ا تھا۔ تو سب پر رعب پڑ گیا تھا کیا مولوی کیا پنڈت کیا چمار کیا چھتری سب ہی کھسیا کر رہ گئے تھے۔ لیکن یہ بھی تو ہوا تھا کہ تحصیل میں رجسٹرار کے سامنے جب بیعہ نامے کے کاغذات پر دستخط کرنے کے لئے اسے قلم دی گئی تھی تو اس نے لپک کر قلم پکڑی تو تھی۔ مگر فوراً ہی کھسیا ہو کر رہ گیا تھا۔

جیسے بدن سے یکایک ہوا نکل گئی ہو اور وہ پچک گیا ہو۔ اس نے اپنے ہاتھ کی اس جگہ کو دیکھا تھا جہاں کبھی اس کا انگوٹھا ہوا کرتا تھا۔ اور جہاں اب گوشت کا چھوٹا سا لوتھڑا تھا۔ اس نے شرمندہ ہو کر قلم رجسٹر کے میز پر رکھدی تھی۔ اور کہا تھا مجھے لکھنا نہیں آتا۔ میں انگوٹھا لگاؤں گا۔ اس نے اپنے سرکاری انگوٹھے کو دیکھا تھا۔ جس کی قیمت سالا جمّا پندرہ ہزار بتاتا تھا وہ صحیح سالم تھا اسے قدرے خوشی ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے یہ سوچ کر اس کا منہ پھر لٹک گیا تھا کہ اگر داہنے ہاتھ کا انگوٹھا کٹوانے کے بجائے اس نے سرکاری انگوٹھا کٹوایا ہوتا تو وہ پڑھا لکھا ہوتے ہوئے بھی خود کو جاہل کیوں کہتا۔ اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کاغذات پر انگوٹھا لگایا تھا۔

گھوڑی کی اولاد

کریم نے جمّا کو پھر گالی دی۔

کمینہ اب بھی نہیں چھوڑتا۔ کہتا ہے انگوٹھا کٹوا دینے سے تو داہنا ہاتھ آدھے سے زیادہ بے کار ہو ہی گیا اب سارا کام تو تم بائیں ہاتھ سے کرنے لگے ہو۔ کیوں نہ داہنا ہاتھ پورا کٹوا دو پچاس ہزار مل جائیں گے اور اتنے روپیوں میں تم دس بیگھ کھیت اور خرید سکتے ہو — مگر اس مرتبہ میں اس کے منہ پر تھوک دوں گا۔"

مل میں جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ کریم نے پریشان خیالات کو ذہن سے جھٹکا۔ بیڑی کے تین چار لمبے لمبے کش لئے پھر اسے دروازے

کے باہر اچھال کر کھڑا ہو گیا۔ کھولی سے نکل کر وہ مل کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں اسے جما مل گیا ۔

کیا بے کریموا کیا سوچا ؟ اس نے کریم کا راستہ روک کر پوچھا۔ کریم سپٹا گیا۔ اس نے جما کو دیکھا اس کے چہرے پر بڑی خبیث مسکراہٹ تھی۔ کریم کو اتنا غصہ آیا کہ اس کا جی چاہا کہ وہ جما کو ماں بہن کی گالی سنا دے مگر جما معمولی گوشت پوست کا بنا ہوا تو تھا نہیں نہ جانے کتنے ہاتھ پیر یہاں تک کہ گردن تک کٹوا چکا تھا۔ کریم کی کیا اوقات تھی وہ اندر ہی اندر اباں کھا کر رہ گیا ــــــ بولا

میں ہاتھ نہ کٹواؤں گا۔ مجھے نہیں چاہیئے کھیت کھلیان۔

سالا۔ جما نے اس کے پیٹ میں گھونسہ مار دیا ــــ

بڑا آیا ہاتھ والا۔ اکڑتا ایسے ہے جیسے برس لی کا ہاتھ لئے پھر رہا ہو۔ ابے زندگی بھر مل کی مزدوری کرے گا۔ ہاتھ گھس گھسا کر گھڑیال کی بیٹھ بن جائے گا۔ ایسا موٹا، بھدا، کھردرا کہ جورو بھی دیکھ کر ڈر رہے گی۔ پچاس ہزار روپیوں سے تو دس بیگھ کھیت خرید کر گاؤں کا زمیندار بن سکتا ہے۔ جن کھیتوں پر تیری سات پشتیں دوسروں کے لئے ہل چلاتی چلاتی مر کھپ گئیں۔ وہ کھیت تیرے ہو سکتے ہیں۔ اور تو چودھری بن کر مینڈھ پر کھڑا ہو کر مزدوروں کو گالیاں دے سکتا ہے۔ ایک ہاتھ دے کر ڈھیر سارے ہاتھ مل سکتے ہیں ــ کیا سمجھے۔

کریم کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ بڑی خفگی سے بولا

میں تیرے جھانسے میں نہیں آؤں گا۔ جما میں ٹنڈا بن کر جینا

نہیں چاہتا ۔ میں جھولیتی آستین سے یاری نہ کروں گا ۔ میں نے انگوٹھا کٹوا کر ہی بھول کی۔ اللہ نے مجھے ٹھیک ٹھاک بنایا تھا تو نے مجھے ناقص بنا ڈالا ۔

جما ہنس پڑا ۔ دیکھ کریم اس معاملہ میں اللہ اور رسول کو بیچ میں نہ لا ۔ یہ اپنا پرسنل معاملہ ہے اچھی طرح سوچ لے ۔

سوچ لیا ہے ۔

اتنا کہہ کر کریم بڑی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور جما وہیں کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا ۔

مل میں جیسے ہی کریم نے اپنا سانچا چلایا۔ کسی نے پیچھے سے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ۔ کریم نے مڑ کر دیکھا تو وہاں رام دین کو پایا ۔ رام دین بھی اسی کھاتے میں کام کرتا تھا ۔ مگر ادھر بہت دنوں سے غائب تھا۔ اسے دیکھتے ہی کریم نے پوچھا ـــــ کہاں تھا رام دین دیس گیا تھا؟

نہ یار، رام دین بولا ـــــ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے تو جاؤں ۔

کیا ٹھیک ٹھاک ۔ کریم نے پوچھا ۔

اس سوال پر رام دین حیرت سے کریم کا منہ تکنے لگا ۔ تمہیں نہیں معلوم کریم بھیا ۔؟

نہیں ۔ کریم نے لاعلمی ظاہر کی ۔ کیا ہوا کچھ بتاؤ ۔

جواب میں رام دین نے اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھا دیا اس کی تین انگلیاں کٹی ہوئی تھیں ۔ کریم کی سمجھ میں ساری بات آگئی ۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی بولا ۔ تو جما نے تمہارا بھی ایکسیڈنٹ کرا دیا ۔"

میں نے خود کہا تھا"

کیوں ؟

پیسے کی ضرورت تھی۔ میرے حصے میں تیس ہزار روپئے آئے ہیں۔

تیس ہزار کریم کا منہ حیرت سے کھل گیا ـــ ہاں بھیا پورے تیس ہزار، چالیس ہزار کا کلیم پاس ہوا ہے۔ دس ہزار روپئے وہ لوگ لیں گے! اور باقی مجھے ملیں گے

مگر تین انگلیوں کے چالیس ہزار ـــ کریم کو یقین نہیں آرہا تھا

ہاں اور کیا ـــ میری عمر ابھی پچیس برس کی ہے نہ میرا ٹسکا زیادہ ہے جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے ٹسکا کم ہوتا جاتا ہے۔ تمہارا ٹسکا مجھ سے کم ہوگا

مگر تمہارے ہاتھ میں اب دو ہی انگلی رہ گئی ہے۔ انگوٹھا اور سب سے چھوٹی جیسے ہتھیلی پہ دو سینگ نکل آئی ہوں۔ ایک ادھر ایک ادھر وہ تو ہے رام دین کچھ رنجیدہ ہوگیا۔ چند لمحے دونوں خاموش رہے

پھر رام دین بولا۔

کریم بھیا ان انگلیوں نے مجھے کیا دیا تھا۔ مہینے کے چار سو روپئے ہی نہ۔ وہ تو اب بھی ملیں گے ـــ یہ انگلیاں کام ہی کیا کرتی تھیں ان مشینوں پر تو سارا کام خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ بس آنکھیں ہونی چاہئیے۔ اس کے علاوہ میرا بایاں ہاتھ تو اب بھی سلامت ہے۔ کچھ دنوں بعد پریکٹس سے سارا کام اس سے کرنے لگوں گا۔ اور انگلیاں کھونے کا غم جاتا رہے گا۔

مگر دوسری طرف دیکھو تو کتنا بڑا فائدہ ہے۔ تیس ہزار روپیوں سے دو آٹو رکشہ خرید سکتا ہوں جن سے روزانہ سَو روپئے کی آمدنی ہو سکتی ہے

وہ تو ہے مگر۔

کریم نے کچھ کہنا چاہا مگر رام دین نے بات کاٹ لی ۔۔ اگر مگر کچھ کام نہیں دیتا کریم بھیا ۔۔ کام پیسہ دیتا ہے ۔ روپئے کے لئے آدمی کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔ میں نے تو صرف اپنی انگلیاں ہی دی ہیں۔ لوگ تو عزت دے دیتے ہیں ایمان بیچ دیتے ہیں، اور مندروں، مسجدوں اور مقبروں کو نیلام کر دیتے ہیں۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے ۔

اتنا کہہ کر رام دین خاموش ہو گیا۔ مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ شباب پر تھی۔ دونوں مزدور اپنے اپنے خیالوں میں غلطاں۔ تھوڑی دیر بعد کریم بولا۔

جمّا تو میرے پیچھے بھی پڑا ہے ۔

اچھا، رام دین نے دلچسپی لی ۔۔ مگر تمہارے انگوٹھے کا ایکسیڈنٹ تو ہو گیا ہے ۔

ہاں ۔ مگر جمّا کہتا ہے کہ پورا ہاتھ کٹوا دو۔

سالا ۔ حرامی ہے ۔ رام دین ہنس پڑا ۔ ہاتھ کے بعد کہے گا پیر کٹوا دو۔ اور آخر میں گردن تک آجائے گا۔ وہ آدمی کو پیاز کی پوٹلی بنا دینا چاہتا ہے اور مزا تو یہ ہے کہ لوگ بنتے بھی ہیں اور ہنسی خوشی بنتے ہیں ۔ اس کا دھندا خوب چل رہا ہے لوگ دھڑا دھڑ اپنے جسموں کا ایکسیڈنٹ کرا رہے ہیں اور گاؤں دیس میں زمین خرید رہے ہیں، محلہ دو محلہ بنوا رہے ہیں۔ ٹیوب ویل لگوا رہے ہیں، ٹریکٹر خرید رہے ہیں ، اولاد کی شادیاں دھوم دھام سے کر رہے ہیں ۔۔ اب یہی دیکھو اپنے رحیم چاچا ہیں نہ ان کی لڑکی کی شادی تھی۔

لڑکے نے اسکوٹر مانگا، چاچا کے پاس اتنے روپئے کہاں تھے۔ اپنا انگوٹھا کٹوا دیا۔ اور دس ہزار اینٹھ لئے۔ رجو نے تو اپنی چار لڑکیوں کی شادی اپنی چار انگلیوں سے کردی۔ اور اب بائیں ہاتھ سے گندگی بھی دھوتا ہے اور کھانا بھی کھاتا ہے

اور تم " یکایک کریم نے پوچھ لیا۔

رام دین اس سوال کیلئے تیار نہ تھا۔ وہ بوکھلا گیا۔ پھر اپنی بوکھلاہٹ پر قدرے قابو پاتے ہوئے دانت نکال کر بولا۔ چلتا ہے یار۔ اسی وقت ساتھ والے کاریگر نے رام دین کو آواز دی اور وہ اپنے لوم کی طرف چلا گیا۔

رام دین کے جانے کے بعد کریم نے اپنے سانچے پر دھیان دیا۔ اس پر ساڑی چڑھی ہوئی تھی۔ جسے دیکھ کر اسے اپنی بیوی یاد آگئی دو سال ہو گئے تھے اس سے ملے ہوئے۔ بیچاری ہر خط میں لکھتی تھی کہ منّا کو تم نے نہیں دیکھا ہے۔ میرے لئے نہ سہی اس کے لیے آجاؤ۔ جب سے کھیت خرید کر گئے ہو یہ بھی دیکھنے نہ آئے کہ ان کھیتوں میں کیسی لہلہاتی فصل اُگ رہی ہے ایسی کہ نظر پڑتے ہی آنکھوں کی روشنی بڑھ جاتی ہے ۔

بیوی اور بیٹے کی یاد نے کریم کو بہت رنجیدہ کر دیا وہ پورا وقت دل میں امڈتے طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا اور جب مل کا سائرن بجا تو اس نے اپنا سانچا بند کیا اور بھاری بھاری قدم اٹھاتا مل سے باہر آگیا۔

پھاٹک سے نکل کر وہ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ اسے شبراتی مل گیا۔ شبراتی بھی اسی مل میں کاریگر تھا۔ مگر ادھر بہت دنوں سے وہ کریم سے ملا تھا۔ کریم نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا بڑے ٹھاٹ تھے۔

اس کے پتلون اور شرٹ پہنے صاحب لگ رہا تھا۔ دھوپ کے چشمے نے تو اور بھی غضب ڈھا دیا تھا بالکل اپ ٹو ڈیٹ والی بات تھی۔ کریم نے اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا۔ پوچھا۔

تو شبراتی ہے ؟

یس ۔ شبراتی نے اکڑ کر کہا ۔

کریم کو ہنسی آگئی ــــ پوچھا" تیرا جنم دوبارہ ہوا ہے کیا ۔

شبراتی خفا ہو گیا ــــ بولا " کریم لگتا ہے تیری کھوپڑی چل گئی ہے "

پھر ؟ یہ تیرا حلیہ یکایک بدل کیسے گیا اور تو اتنے دنوں تک غائب کہاں رہا " ــــ ؟

میں انڈر گراؤنڈ چلا گیا تھا ۔

کیا مطلب ، کریم نے پوچھا ۔

شبراتی کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی اس نے بڑے اسٹائل سے چشمہ اتارا ۔ کریم نے اس کے چہرے کو دیکھا تو گھبرا کر پوچھا ۔

ارے تیری ایک آنکھ کو کیا ہوا

شبراتی نے روشن آنکھ دبائی حالانکہ اس کا چہرہ اس حرکت سے اور بھی بھیانک ہو گیا ۔ مگر کریم کی سمجھ میں بات آگئی

ایکسیڈنٹ . . . ؟

شبراتی نے اثبات میں گردن ہلا دی ۔

کتنا ملا ؟

ساٹھ ہزار ۔۔۔"

ہائیں، کریم کو جھٹکا سا لگا کیا کئے اتنے سارے روپئے۔

گاؤں میں ایک ٹریکٹر خرید لیا ہے، کرائے پر دیتا ہوں روز کی آمدنی چالیس پچاس روپئے کی ہو جاتی ہے۔ ہر لے نہ پھٹکری رنگ چوکھا ۔۔۔ اپنی اب سیاست میں کودنے والا ہے۔ اس بار جو پرانے ساتھیوں سے ملنے چلا آیا ہوں ورنہ اب اپن کو ٹائم کی شارٹیج ہو گئی ہے۔ سیاست کے ہزار لفڑے ہوتے ہیں۔ ڈکیتی، قتل اغوا سارے فن سیکھ رہا ہوں،

اور مل کی مزدوری

اس پر تو کب کی لات مار دی، کلیم پاس ہوتے ہی راضی نامہ داخل کر دیا تھا کریم نے شبراتی کے چہرے کو دلچسپی سے دیکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ویسے تو سب ٹھیک ہے مگر ایک بات ہے۔ شبراتی تو یک چشمیہ ہو گیا۔

شبراتی نے جلدی سے چشمہ چڑھا لیا۔ اور خفا ہوتے ہوئے بولا۔

دیکھ کریم مجھے چھیڑ مت، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔

اس میں خفا ہونے کی کیا بات ہے کیا یہ حقیقت نہیں کہ اب تیرے ایک ہی آنکھ ہے۔ کریم بدستور مسکراتا رہا۔

شبراتی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا ہاتھ اٹھنے ہی والا تھا کہ وہاں جمنا آ ٹپکا جسے دیکھ کر شبراتی کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

وہ لپک کر جمنا سے جا لپٹا۔

بڑے ٹھاٹ بنا بیٹھے ـــــ جمّا نے شبراتی کو اپنے سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

ہاں استاد تمہارا کرشمہ ہے۔

سب ٹھیک ٹھاک ہے نہ

ہاں استاد میں تو الیکشن لڑنے والا ہوں"

جمّا نے قہقہہ لگاتے ہوئے ایک دھپ شبراتی کی پیٹھ پر لگائی بولا

لڑو ضرور لڑو ۔ اب تمہیں کون روک سکتا ہے ۔

اتنا کہہ کر جمّا کریم سے مخاطب ہوا ـــ دیکھے کریم یہی وہ شبراتی ہے جو مجھ سے مانگ کر بیڑی پیتا تھا، پاؤ روٹی اور چائے پر گزارا کرتا تھا۔ اور اب تو ہی دیکھے میں کیا بولوں ۔ سامنے کھڑا ہے اور الکشن لڑنے کی باتیں کر رہا ہے۔

استاد تم کریم کو بھی ٹرک بتاؤ۔ شبراتی نے جمّا کو مشورہ دیا۔ وہ غالباً بھول گیا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کریم نے اسے بک چشمیہ کہا تھا ۔

یہ تو گدھا ہے ۔ جمّا بولا ۔ سسُرے کو سمجھاتے سمجھاتے ہار گیا ۔ مگر مرغے کی ایک ہی ٹانگ رہی ۔ کہتا ہے مجھے ہاتھ چاہیئے پیسہ نہیں ۔ کئی بار کہا کہ پچاس ہزار روپئے سے تو رئیس بن سکتا ہے مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات آوے جب نہ ۔

کیوں کریم ، سمجھتا کیوں نہیں ۔ شبراتی نے پوچھا

مگر کریم نے کوئی جواب نہ دیا ۔ خاموشی سے ہٹ گیا۔

راستہ میں دلبہار پان ہاؤس پر بیڑی سلگانے کے لئے رکا ۔

تو وہاں اسے بیوی کا خط ملا ۔ اسی پان کی دوکان کے پتے پر وہ

خط منگوایا کرتا تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا اور وہیں کھڑے کھڑے خط پڑھنے لگا۔ بیوی نے گھر بھر کی خیریت دے کر اس کی خیریت اللہ سے نیک چاہ کر اور ڈھیر ساری دوسری باتیں لکھ کر آخر میں یہ اطلاع دی تھی کہ رحیم چاچا نے داماد کو اسکوٹر بھی دے دیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ افسوس بھی ظاہر کیا تھا کہ بیچارے کا انگوٹھا مل میں مشین کے نیچے آگیا تھا اور سٹ سے کٹ گیا تھا اسی طرح، جسطرح تمہارا انگوٹھا تمہاری لاپرواہی سے کٹ گیا تھا۔

اتنا لکھنے کے بعد اس نے لکھا تھا کہ اب ہاتھ پیر سنبھال کر کام کرنا۔

اس رات کریم بستی میں کھانا کھانے نہیں گیا۔ بستر پر پڑا سوچتا رہا اسے بیوی کی یاد نے سخت پریشان کیا۔ اسے اپنا بیٹا یاد آیا۔ انگوٹھا دے کر خریدے ہوئے کھیت یاد آئے جس میں فصل لہلہانے لگی تھی۔ پھر اس کے سامنے رام دین آگیا۔ ہنستا مسکراتا ہوا ۔ رحیم چاچا آگئے جنہوں نے داماد کو اسکوٹر تک دے ڈالا تھا۔ اور جوار میں اپنی طوطی بلوادی تھی ۔

شبراتی آگیا جو چشمہ چڑھا کر صاحب بن گیا تھا اور الکشن کی باتیں کرنے لگا تھا وہ سوچنے لگا۔

ان میں سے کوئی بھی تو اپنی حرکت پہ نادم نہ تھا۔ سبھی خوش و خرّم تھے، سبھی زندہ و جاوید تھے، سبھی گھر بار بسائے اینٹھتے پھر رہے تھے۔ تو آخر وہ کیوں اتنا حسّاس ہے کہ ہاتھ کٹوانے کے تصور سے ہی بھڑک جاتا ہے؟ کیا جمّا کی بات میں وزن نہیں۔

اس کے ذہن میں یہ سوال بار بار گونجنے لگا۔ پھر جیسے جیسے رات

بھنے لگی وہ دھیرے دھیرے پگھلنے لگا۔ اس کا وجود بوند بوند بن کر ٹپکنے لگا۔ اور جب مل کے سائرن نے بارہ بجنے کا اعلان کیا تو اس نے آخری کروٹ لی اور نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے اس نے اپنے وجود کو سمیٹا اور جھولتی آستین سے سمجھوتہ کر کے سو گیا ــــ

سارا کام بڑی تیزی، خاموشی اور ہوشیاری سے ہوا۔ ڈاکٹر نے پھٹا پھٹ آپریشن کر ڈالا، مل کے بابو نے کاغذات تیار کر ڈالے، بیمہ کے ڈاکٹر نے یہاں وہاں جہاں کہیں بھی دستخط کی ضرورت تھی کر دی۔ اور اب اس بات کا انتظار تھا کہ کریم ٹھیک ہو کر اسپتال سے واپس آجائے تو معاوضہ کی رقم ادا ہو۔

مگر جس دن کریم کو اسپتال سے چھٹی ملی اور وہ جھولتی آستین کے ساتھ جمّا کے کندھے پر اپنا بایاں ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ اسپتال کی سیڑھیاں اتر رہا تھا اسی وقت مل کا بابو دوڑا دوڑا آیا اور اِدھر اُدھر تاک کر بولا ــــ

جمّا غضب ہو گیا۔

کیا ہوا ــــ جمّا کے پیر سیڑھیوں پر چپک گئے۔

بابو نے پھر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا اور جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ کوئی سن نہیں رہا ہے تو سرگوشی میں بولا ــــ

ابھی ابھی سرکار کا حکم ہوا ہے کہ ایک ہاتھ کٹنے پر ایک مشت رقم نہیں دی جائے گی۔ بلکہ ہر ماہ دو سو روپئے معاوضہ کے طور پر دئے جائیں گے ــــ بس۔

جمّا نے گھبرا کر کریم کو چھوڑ دیا وہ دھڑام سے پختہ سیڑھیوں پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

مل کے بابو نے کریم کو نظر انداز کر دیا اور جمّا کے کان کے پاس اپنا منہ کر کے بولا۔

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم ہوا ہے کہ اگر دونوں ہاتھ کٹ جائیں تو ایک لاکھ روپئے نقد دئے جائیں گے۔

جمّا کا دل قابو میں آ گیا اس نے بیہوش کریم کو اپنے کندھے پر لاد لیا۔ اور اسپتال کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا مل کے بابو سے بولا۔

تو ٹھیک ہے۔ تم پرانے کاغذات پھاڑ ڈالو اور نئے کاغذات تیار کرو۔ میں ادھورا کام پورا کرتا ہوں۔

بھاتال اور پاتال

راوی یوں بیان کرتا ہے کہ
مادرِ گیتی نے جوڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ ایک لال بندر کی طرح اور دوسرا لال چقندر کی طرح۔ مادرِ گیتی نے پرورش و پرداخت کے لیے ایک کو کرۂ ارض کے مشرق میں ڈالا اور دوسرے کو مغرب میں۔
پھر دونوں بیٹے یہ بھول گئے کہ وہ ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔ دونوں کم و بیش ایک ہی قسم کی آب و ہوا میں پروان چڑھے اور اپنی سوجھ بوجھ، عقل و فہم ہمت و دانشمندی سے بیحد طاقت ور بن گئے۔ مادرِ گیتی نے ان سے پہلے بھی متعدد بیٹوں کو جنم دیا تھا۔ اور ان کے بعد بھی کئی بیٹے عالم وجود میں آئے۔ لیکن جوڑواں بیٹوں سے طاقت میں کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹوں کا ایک گروہ مشرقی بندر کی پناہ میں آگیا۔ اور دوسرا گروہ مغربی چقندر کے سائے میں بیٹھ گیا۔ کچھ بیٹے ایسے بھی تھے جن کا کہنا تھا کہ وہ آزاد ہیں۔ خود مختار ہیں۔ اور کسی گُٹ میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ سب کے سب

اور چقندر کے دائرۂ استحصال اور حلقۂ اقبال میں کسی نہ کسی طرح شامل تھے اوران کے قارورے سے اپنا قارورہ ملاتے رہتے تھے۔ کہ صحت مندی کے لیے یہ عمل ضروری ہی نہ تھا۔ بلکہ وجود قائم رکھنے کے لیے لازمی بھی تھا۔

لیکن ایک میان میں دو تلوار نہیں رہتی اور ایک جنگل میں دو شیر بھی نہیں رہ پاتے تو ایک ہی عمل تشکل اور دخل کے دو طاقت ور کرۂ ارض پر کس طرح رہ پاتے اور اگر رہ جاتے تو یقیناً ان کا نطفہ حلال نہ ہوتا۔ چونکہ وہ ایک ہی ماں کے جوڑواں بیٹے تھے اور دونوں کی رگوں میں بہتا سیال ایک ہی چشمے سے پھوٹا تھا۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے اور دشمن بھی ایسے کہ فریق مقابل کی مکمل تباہی سے کم کے نصب العین پر وہ اکتفا نہ کرنا چاہتے تھے۔ اور چونکہ ہر دو فریق کے ساتھ دوسرے بھائیوں کا بٹوارہ تقریباً نصف نصف تھا اسلئے نصب العین محض فریق مقابل کی تباہی نہ تھا بلکہ آدھے کرۂ ارض کی بربادی تھا اور اس طرح دونوں نے سمجھ بوجھ کر، سوچ بچار کر. غور و فکر کر کے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان کی فتح کرۂ ارض کے نصف حصّے کو نیست و نابود کرنے میں ہی مضمر تھی۔ یعنی مجموعی طور پر وہ پوری دنیا کو مشترکہ اقدام سے بھون ڈالنا چاہتے تھے۔

لیکن ایسی صورت میں فتح یاب کون ہوگا اور اس فتح کا جشن کون منائے گا؟

یہ سوال تھا تو دونوں کے سامنے لیکن اسے اٹھاتے ہوئے وہ ڈرتے تھے کہ مبادا فریق مقابل اسے ڈرپوک نہ سمجھے یا ان کا گروہ انہیں جبہ پدی چہ پدی کا شوربہ نہ سمجھ بیٹھے۔ ان حالات میں انہیں ، بڑھیا، کون مانے گا۔

اور یہی احساس ' بڑھیا ' ان دونوں کو ہر وقت تناؤ میں رکھتا تھا - اور وہ اپنی جانگھوں کے درمیانی حصے سے زہریلا سفوف گرایا کرتے تھے - جن کی مدد سے وہ انار بنانے میں جٹے ہوئے تھے - چھچھوندر کی طرح چھوں چھوں کر کے پھس ہونے والا انار نہیں بلکہ مادر گیتی کے شکم میں داخل ہونے کی صلاحیت رکھنے والا انار ایسے کتنے ہی انار انہوں نے اپنی خلوت میں جمع کر ڈالے تھے -

لیکن جب اناروں کی بہتات ہو گئی اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ یقین ہو گیا کہ اب وہ اس لائق ہو گئے ہیں کہ انار اپنی ماں کے شکم میں گھسیڑ سکتے ہیں اور اس کے پرخچے اتنی ہی آسانی سے اڑا سکتے ہیں - جتنی آسانی سے وہ چھینک سکتے ہیں - تو انہیں اطمینان ہو گیا کہ میان میں صرف انہیں کی تلوار رہے گی -

مگر مشکل یہ تھی کہ دونوں ایک دوسرے کے راز سے واقف بھی تھے - اس لیے کوئی قدم اٹھاتے سے پہلے جوابی کاروائی کی ڈر سے ان کا معدہ فوراً خراب ہو جایا کرتا تھا -

آگے راوی یوں بیان کرتا ہے کہ

ان کی دیکھا دیکھی بہت سے چھٹ بھیوں نے اپنی جانگھوں کے درمیان سے زہریلا سفوف گرانا شروع کر دیا - ان میں سے کچھ نے تو انار بھی بنا ڈالے اور خود مختاری کے خواب تک دیکھنے لگے - لیکن ابھی ان کے خواب اس طرح تھے جیسے گھوڑے کے نیچے پڑی لید -

انھیں چھٹ بھیوں میں بھاتال اور پاتال بھی تھے - یہ دونوں پیدائش کے وقت جڑے ہوئے تھے - اور ایک عرصے تک ایک جسم ایک قالب تھے -

بعد میں آپریشن کے ذریعہ دونوں کو الگ کر دیا گیا تھا۔ جب تک ایک دوسرے میں پیوست تھے ایک تھے، الگ ہوئے تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ دشمن کا دشمن دوست مقولہ پر عمل کرتے ہوئے بھاتال بندر کی گروہ میں شامل ہو گیا۔ اور پاتال چقندر کے حلقۂ رفاقت میں آ گیا۔

اُدھر بندر اور چقندر تھوک میں انار بناتے رہے۔

ادھر بھاتال اور پاتال خفیہ طور پر اپنی اپنی جانگھوں کے درمیان سے زہریلا سفوف گراتے رہے اور جب ان کی مقدار کافی ہو گئی یعنی وہ دونوں انار بنانے کی پوزیشن میں ہو گئے تو کھسر پھسر کے بعد ہاتھا پائی ہو گیا اور آخر میں چلانے لگے۔

بھاتال نے کہا پاتال پھلجھڑی سے آگے بڑھ رہا ہے۔

پاتال نے کہا غلط۔ ہم تو کبوتر کے پروں پر چھڑکنے کے لئے سفوف بنا رہے ہیں۔ تاکہ ان کی پرواز بلند ہو جائے البتہ تم نے بہت پہلے ہی اپنی آواز سے صحرا کا حمل ساقط کر دیا تھا۔ وہ آواز ہماری سماعت پر گراں گزری تھی

لیکن وہ تو پیغام امن و آشتی تھا کہیں بھی پہونچے۔ بھاتال نے صفائی پیش کی۔

" بجا فرمایا " پاتال نے مسکرا کر کہا۔ " وہ پیغام یہاں بھی پہنچا تھا اسی لئے تو ہم امن کے پیغامبر کبوتر کے پروں پر چھڑکنے کے لیے چمکدار سفوف بنا رہے ہیں۔ ہم اس محبت کا جواب محبت سے ہی تو دے رہے ہیں "

بھاتال نے دل ہی دل میں سوچا کہ پاتال کی جانگھیں ایک مٹھی سفوف گرا دیتی

اینٹھ جائیں گی۔ کمبخت کی پتلی پتلی ٹانگوں میں دم ہی کتنا ہے۔ ہماری ٹانگیں اس سے کئی گنا تگڑی ہیں۔ اور ہم سفوف بھی تیزی سے گرا رہے ہیں۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان ہوا ہی تھا کہ پاتال ایک چال چل گیا۔ اس نے بھاتال سے کہا کیوں نہ ہم اپنی ٹانگیں پھیلا کر ایک دوسرے کو دکھائیں کہ ان کے درمیان سے کتنا سفوف خارج ہو رہا ہے۔ اور آیا وہ سفوف کبوتر کے پروں پر لگانے والا ہے، یا انار میں استعمال ہونے والا ہے۔"

یہ سن کر بھاتال بولا ــ ہٹ تری کی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے روبرو ننگے ہو جائیں ــ بے ہودہ خیال ہے۔

تو پھر؟

تو پھر؟

دونوں نے ایک دوسرے سے سوال کیا لیکن جواب بھی سوال کی طرح ایک جیسا ہی تھا جو دونوں کو معلوم تھا۔ اس لئے دونوں نے خاموشی اختیار کر لی اور خلوت میں سفوف گراتے رہے۔ پھر یوں ہوا کہ لال بندر اور لال چقندر کی خلوتوں میں انار ہی انار ہو گئے۔ اور ان کی جانگھوں کے منڈوے تلے سفوف ہی سفوف تو انھوں نے سوچا کہ اب بس کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کافی ہے۔ یعنی کافی ہی نہیں بہت کافی ہے۔ مادرِ گیتی کے شکم میں گھس کر کوکھ کو پھاڑ ڈالنے کے لئے تو دو چار انار ہی کافی تھے۔ اس کے علاوہ انھیں یہ فکر لاحق ہو گئی کہ چھٹ بھیئے بھی سفوف گرانے لگے ہیں۔ اور کئی ایک نے تو انار بھی بنا ڈالے ہیں۔ ان میں دو چار نے تو ایسے انار بھی بنا ڈالے ہیں کہ وہ اپنے طور پر ہی مادرِ گیتی کے پرخچے اڑا سکتے ہیں۔

کوئی بڑھیوں کی اجارہ داری نہیں رہ گئی تھی۔ ایسی صورت میں بڑھیوں کے سارے انار بے کار ہو رہے تھے۔

یہ صرف مسئلہ ہی نہیں بڑا مسئلہ تھا۔

انہوں نے سوچا کہ چھٹ بھیّوں کو کسی طرح انار بنانے سے روکنا چاہیئے کہ یہ حق صرف ان دونوں کو تھا۔ دونوں نے سر سے سر جوڑا۔ خوب غور و خوض کیا اور طے کیا کہ وہ اب مزید سفوف گرانا اور انار بنانا بند کر دیں اس طرح ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دوسرے چھٹ بھیّے بھی ایسا کریں گے اور ان کا بڑکپن قائم رہے گا۔ اس فیصلہ کو انہوں نے ایک معاہدہ کی شکل دے دی اور اس کے بعد سفوف گرانا بند کر دیا۔

شعاعِ مہر کی طرح خبر کرۂ ارض پر پھیل گئی۔

بھاتال نے سنا تو بغلیں بجاتے ہوئے بولا۔

جانتے ہو میں نے ہی بندر کو اس بات پر راضی کیا تھا کہ وہ چقندر سے ایک معاہدہ کرلے اور انار بنانا بند کر دے۔

پاتال اپنے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

لیکن تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے بھی چقندر کو اس معاہدہ کے لئے راضی کیا تھا۔

پھر ؟

پھر ؟

دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ مسکرائے۔ بھاتال بولا۔

"ٹھیک ہی ہوا۔ شاید کرۂ ارض پر امن بحال ہو جائے۔"

"بجا فرمایا، آپ نے بہت ممکن ہے کہ اس عمل سے مادرِ گیتی کو چین نصیب ہو یا کم از کم اس کا درد ہی کم ہو۔" پاتال نے امید ظاہر کی۔

پھر؟

پھر؟

دونوں نے ایک دوسرے کو دوبارہ دیکھا دوبارہ مسکرائے بھی اور اپنی اپنی جھولی سے ایک ایک انار نکال کر ایک دوسرے کو اس طرح دکھایا جیسے ٹھینگا دکھا رہے ہوں۔ اس عمل کے بعد دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"چھوڑو بستیوں کو اور چھوڑو کرۂ ارض کے دوسرے حصّوں کو وہاں امن قائم ہو رہا ہے تو ہونے دو۔ آؤ ہم دونوں اپنے آپ کو تباہ کرنے کا عمل جاری رکھیں۔ ہمارے پاس اتنے انار تو ہونے ہی چاہئیں کہ ایک دوسرے کو نیست و نابود کر سکیں۔"

اتنا کہہ کر دونوں مخالف سمتوں میں بیٹھ کر زہریلا سفوف گرانے لگے۔

غٹر غوں

باہر پھر شور سنائی دیا۔ وہی نعروں کا غلغلہ جسے سن کر آشا کی روح فنا ہونے لگتی تھی اس کے بدن کے تمام رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ منہ کھلا کا کھلا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں اس کا جی چاہتا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس کے اندر سما جائے کہ اس جگر خراش آواز سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے۔

اس نے اپنی ماں کو جھنجھوڑا ــــــ "ممی"

شکنتلا کے سر میں صبح سے درد تھا۔ اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے دن بھر کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ مضمحل اداس، افتاں و خیزاں ڈگ ڈگ گھر میں اِدھر سے اُدھر پھرتی رہی تھی اور تھوڑی دیر قبل اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ رام سنگھ چار روز قبل کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا اور اسی درمیان یہ فساد پھوٹ پڑا تھا اور بات صرف یہ تھی کہ دو لڑکوں میں کھیل کھیل میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ اور اتفاق سے ان میں ایک ہندو تھا۔

اور دوسرا مسلمان - پھر کیا تھا ہندوؤں کی اکثریت کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا اور مسلمانوں کی انفرادیت ختم ہونے لگی تھی اور وہ دونوں اپنے پسندیدہ کھیل کھیلنے لگے تھے۔ کشت و خون کا کھیل، چار دنوں سے قتل و غارت گری، آتش زنی، لوٹ مار، اغوا کا بازار گرم تھا اور گرم بھی ایسا کہ آگ کہیں بھی لگی ہو دھواں پورے شہر پر پھیلا ہوا نظر آتا تھا، کرفیو تو حسبِ معمول لگا ہی تھا اور یہی وجہ تھی کہ لوگ بے خطر اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جب چاروں طرف خاموشی ہو تو کسی مکان یا دکان میں آگ لگا کر کھسک جانا کتنا آسان ہے یا کسی کے گھر میں گھس کر لوٹ مار کرکے بھاگ جانا، یا کسی لڑکی کا اغوا کرلینا، بائیں ہاتھ کا کھیل ہو جاتا ہے۔ اور اسی لیے محافظ قانون پہلے کرفیو لگا تے ہیں۔ پھر بات آگے بڑھتی ہے۔

تو بات اتنی آگے بڑھ گئی تھی کہ لوگ دن دہاڑے گھروں میں آگ لگا رہے تھے، املاک لوٹ رہے تھے، لڑکیوں اور عورتوں کی بے عزتی کر رہے تھے۔ اور یہاں وہاں خون میں لتھڑی لاشیں چھوڑ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ کہ بات تو پہلے ہی آگے بڑھ گئی تھی۔

شکنتلا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کیا ہوا ۔"

ممی باہر غنڈے آگئے ہیں۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

شکنتلا نے اسے اپنے سینے سے نہیں لگایا۔ بس اسے دیکھنے لگی۔

کھوئی کھوئی سی۔ اسے دلاسہ بھی نہیں دیا۔ ہمت بھی نہیں بندھائی، منہ سے کچھ بولی ہی نہیں۔ بس اس پر اپنی نگاہیں جمائے رہی۔ آشا نے اس سے لپٹنا چاہا تو اس نے

اسے پرے ہٹا دیا۔ وہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت باہر نعرہ پھر بلند ہوا۔ اس بار آواز ان کے گھر کے پاس تھی۔ آشا گھبرا کر رونے لگی لیکن شکنتلا یوں ہی بیٹھی رہی جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو، جیسے کوئی عفریت اس کے دل پر بیٹھ گئی ہو۔ آواز سے نہ تو وہ ڈری نہ گھبرائی، نہ بھاگی نہ روئی، بس کسی مجسمے کی طرح ساکت رہی اور اپنے گھر کی منڈیر پر بیٹھے اس کبوتر کو دیکھنے لگی۔ جو ساکت اور جامد تھا اور اپنے سر کو اپنی گردن میں دبائے ہوئے خاموش بیٹھا تھا

"یہ کبوتر ایسے موقعوں پر اس طرح کیوں نظر آتا ہے" اس نے سوچا

وہ کبوتر کو دیکھ رہی تھی جو ساکت و جامد تھا اور اپنے سر کو اپنی گردن میں دبائے ہوئے خاموش منڈیر پر بیٹھا تھا۔ گھر میں وہ اپنی ماں کے ساتھ اکیلی تھی۔ اس وقت باہر شور بلند ہوا۔ وہ چیخ مار کر اپنی ماں سے لپٹ گئی ماں نے اسے چھاتی سے لگا لیا اور گڑگڑا کر خدا سے دعائیں مانگنے لگی یا اللہ میری بچی کی عزت و آبرو تیرے ہاتھ ہے۔ تو ہی مدد کرنے والا ہے۔ کرم فرما رحیم و کریم۔

لیکن وہ جو چاہتی تھی وہ نہ ہوا۔ بلکہ ہوا یوں کہ دروازہ توڑ کر بلوائی اندر آ گئے۔ ان میں سے ایک نے اسے ماں کی گرفت سے چھینا، کندھے پر لادا اور بھاگ نکلا۔

پھر رام سنگھ اسے اپنے دیس لے آیا اور شکیلہ سے شکنتلا بنا دیا۔ کتنا آسان تھا شکیلہ سے شکنتلا بنا دینا۔ حرفوں کی بس ذرا سی تبدیلی ہی تو ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ کیا ہوا تھا۔

اس نے حالات سے سمجھوتہ تو کیا، کرنا ہی پڑا، مجبوری جو تھی۔ لیکن حرفوں کی اس معمولی سی تبدیلی سے ۱۹ سال گزر جانے پر بھی وہ مصالحت نہ کر سکی تھی۔ اور اندر ہی اندر سینے کے کہیں بہت ہی اندر وہ اپنے نام کو صحیح ترتیب و تلفظ کے ساتھ دبائے بیٹھی تھی۔ اور اس کے اظہار کے لیے وقت اور موقعہ کا انتظار کر رہی تھی

وقت آگیا — وہ بڑبڑائی

اس کی بڑبڑاہٹ پر آشا نے اسے کندھے سے جھنجھوڑا۔ ممی کیا بک رہی ہو۔ باہر بلوائی شور کر رہے ہیں۔ دروازہ توڑ رہے ہیں۔ وہ اندر آجائیں گے ممی کچھ کرو۔ مجھے بچاؤ ممی"

وہ زور زور سے رونے لگی۔

لیکن شکنتلا منڈیر پر بیٹھے اس کبوتر کو دیکھتی رہی جو پتھر کا تراشا ہوا لگ رہا تھا اس کا انہماک اس وقت ٹوٹا جب دروازہ ٹوٹ کر صحن میں گرا۔ اور دس بارہ نوجوان لڑکے ان کی طرف لپکے۔

حنیف لڑکی کو اٹھاؤ۔" ان میں سے ایک چلایا۔

آشا چیخ مار کر ماں سے لپٹ گئی۔

لیکن شکنتلا ایک جھٹکے سے کھڑی ہوگئی۔ اس نے مضبوطی سے آشا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے تقریباً گھسیٹتی ہوئی حملہ آوروں تک لائی اور ان کی طرف اسے ڈھکیلتے ہوئے کسی بدروح کی طرح چیخی۔

"میں نے ۱۹ سال تک انتظار کیا۔ اب لے جاؤ عائشہ کو"

حنیف نے لپک کر آشا کو اپنے کندھے پر لا دلیا۔ اور پھرتی سے باہر نکل گیا اسی کے ساتھ جب دوسرے بلوائی بھی بھاگ گئے۔ تو شکنتلا کو دفعتاً احساس ہوا کہ منڈیر پر بیٹھا ہوا کبوتر اس کے سینے میں اتر آیا ہے اور وہاں گردن پھلا پھلا کر غٹر غوں غٹر غوں کرنے لگا ہے ــــ

مزدورنی

عذرا نے بڑی مایوسی سے چاروں طرف دیکھا۔ ہوا تیز ہو گئی تھی۔ گھٹا گھنگھور ہوتی جا رہی تھی۔ کسی وقت بھی بارش شروع ہو سکتی تھی۔ ایسے کالے کالے ڈراؤنے تہہ در تہہ بادل گھرے چلے آ رہے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا طوفانِ نوح آجائے گا۔ چاروں طرف سمندر ابل پڑے گا ——

" بارش شروع ہو گی تو گھنٹوں بند ہونے کا نام نہ لے گی "

—— اس نے سوچا

" مگر کروں تو کیا کروں، کوئی مزدور ملتا ہی نہیں۔ کیا ہندوستان کے سارے غریب مر کھپ گئے —— " اس نے دور کھڑی اپنی فیاٹ کار کو دیکھا —— " وہاں تک کیسے پہونچوں۔ انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ڈرائیور

کو لیتی جانا۔ مگر کمبخت ڈرائیونگ کا شوق لے ڈوبا۔ اب یہ سامان کس سے اٹھوا کر کار تک لے جاؤں۔"

وہ بڑبڑائی۔

اس نے زمین پر رکھے بیگ کو دیکھا۔ جھکی، اٹھایا۔ مگر فوراً ہی اسے پھر رکھ دیا ــــ

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں خود اٹھا کر کار تک لے جاؤں۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی تک بھی ہے۔ مگر مزدور؟ ــــ ہاں یاد آیا اسٹور والے سے کہوں کہ وہ بیگ گاڑی تک بھجوا دے۔" اس نے سوچا اور تیزی سے اسٹور میں داخل ہو گئی۔

"یس میڈم، سیلس گرل اس کی طرف لپکی۔

"کوئی میرا سامان اٹھا کر میری کار تک چھوڑ سکتا ہے؟"

اس نے سامان پر نظریں گاڑتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت تو کوئی نہیں ہے۔ ویسے آپ کو مزدور باہر مل جائینگے کئی ایک،

کئی ایک؟ وہاں تو ایک بھی نہیں ہے"،

"سوری میڈم" کہہ کر سیلس گرل دوسرے گراہک کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"گھمنڈی ہے۔ منہ جلی کو اپنی خوبصورتی پر ناز ہے"،

وہ بڑبڑائی اور باہر نکل کر اپنے بیگ کے پاس پھر کھڑی ہو گئی ــ

اب بجلی بھی چمکنے لگی تھی۔ اور بوندا باندی بھی شروع ہو گئی تھی۔"

"کیا کروں"

وہ بالوں کو درست کرنے لگی مگر وہ طوفانی ہواؤں سے الجھتے ہی رہے۔ ساڑی کو سنبھالنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ کبھی آنچل اڑ جاتا، کبھی وہ جسم سے چپک جاتی اور اسے گھوم گھوم کر ٹھیک کرنا پڑتا ــ لٹو کی طرح گھومنے میں اسے بڑی کوفت ہو رہی تھی۔ گھر میں آئینہ کے سامنے ساڑی پہنتے وقت تو وہ گھنٹوں گھومتی رہتی تھی۔ بڑا مزا آتا تھا جسم کو ہر زاویے سے دیکھنے میں۔ مگر گھر میں بند کھڑکیوں کے پیچھے، آئینہ کے سامنے والی بات اور ہوتی ہے اور بازار میں کھڑے ہو کر گھومنے والی بات اور۔

یہاں تو کوفت ہی کوفت تھی۔

"کس مصیبت میں پھنس گئی" اسے سخت غصہ آیا۔

"اے"

اس نے ادھر سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو پکارا۔

"کہئے، وہ آدمی پاس آکر بولا۔

یہ سامان میری گاڑی تک، یعنی میری کار تک پہونچا دو گے؟

"سامان؟"

"ہاں پیسے دوں گی ــ جو کہو گے"،

"کہاں لے جانا ہے؟"

وہ فیاٹ کھڑی ہے نا، وہاں تک۔ ایک روپیہ دوں گی۔

اس آدمی نے کار کو دیکھا

" ہنھ - میرے پاس چھ فیاٹ اور چار شیورلیٹ ہیں -

گڈ بائی، اس نے کہا اور چل دیا -

کیا مصیبت ہے وہ بڑبڑائی - سمجھ میں نہیں آتا - کون پیسہ والا ہے اور کون مزدور - آخر جن کے پاس دولت ہے وہ اپنی شکل الوؤں جیسی کیوں بنائے رہتے ہیں - کہ شریف آدمی دھوکہ کھا جائے - چھ فیاٹ اور چار شیورلٹ - ہوں - اس نے نفرت سے کہا -

" اب کیا کروں ؟" اس نے خود سے پوچھا - پانی کی موٹی موٹی بوندیں پڑنے لگی تھیں، ہوا کا زور بھی بڑھ گیا تھا، بجلی پورے آسمان پر تڑ تڑانے لگی تھی، لوگ جلدی جلدی دوکانیں بند کرنے لگے تھے، بھاگ کر بھاگ رہے تھے، سڑک ویران ہونے لگی تھی، سرِ شام ہی آدھی رات اترنے والی تھی -

" سنو "

اس نے گھبرا کر ایک دوسرے آدمی کو پکارا -

وہ شخص ٹھٹکا، مڑ کر اسے دیکھا - پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اس کے قریب آیا -

" آپ نے مجھے آواز دی ؟ " اس نے پوچھا

" جی ہاں "

" فرمائیے "

" میں بڑی مصیبت میں ہوں - کوئی آدمی مل سکتا ہے جو اس بیگ کو میری کار تک پہنچا دے، میں بیس روپے ٹپ دوں گی "

اس آدمی نے جھک کر بیگ اٹھایا، پھر اسے زمین پر رکھدیا، اور سیدھا کھڑا ہوکر عذرا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

پانچ کلو سے زیادہ وزن نہیں ہے محترمہ۔ اگر اتنا بوجھ بھی نہیں اٹھا سکتیں تو بیگ کو یہیں چھوڑ دیئے، خراماں خراماں اپنی کار تک جائیے اس میں بیٹھ کر ملیبار ہل جائیے اور خود کو مع کار بحرِ عرب کی لہروں کو سونپ دیجئے۔

"خس کم جہاں پاک"

کیا بکتے ہو" وہ گرجی۔

"آداب عرض ہے"

وہ چلا گیا تو اس نے اپنے یاقوتی ہونٹوں کو موتیوں کی طرح چمکتے دانتوں کے تلے لاکر زور سے دبایا۔

"کوئی کمیونسٹ لگتا ہے۔ نابہنجار، کسی کو یہ لوگ خوش دیکھ ہی نہیں سکتے۔ کار کا نام سنتے ہی جل بھن گیا۔ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا مزدور ہو جائے۔ ہاں مزدور۔ مگر کمبخت مزدور ایک بھی نہیں ہے۔ کیا کروں سمجھ میں نہیں آتا۔"

"او۔ بھائی"

اس نے تقریباً روتی آواز میں ایک تیسرے آدمی کو پکارا۔ وہ شخص چلتے چلتے رک گیا، اور گھور کر اسے دیکھا اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

" بولو بہن کیا خدمت کروں "۔ اس نے قریب آکر پوچھا "

" یہ بیگ میری کار تک چھوڑ دو۔ پندرہ روپئے دوں گی "۔

اس شخص نے بڑی للچائی نگاہوں سے اس کے سراپا کا جائزہ لیا۔ پھر دھیرے سے بولا۔ " ہائے کیا قیامت کا حسن ہے۔ چلو میری جان "

اس نے بیگ اٹھانا چاہا۔ مگر عذرا نے گھبرا کر بیگ چھین لیا۔

' نہیں تم جاؤ '

" قتل کر ڈالا، ظالم نے "

" شٹ اپ "

وہ شخص ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔

جان من۔ کار تک کیا، گھر تک لے چلوں گا۔ سر کے بل اور قسم تمہاری ادا کی ایک پائی نہ لوں گا۔"

" تم جاتے ہو کہ شور مچاؤں "

اس نے دھمکی دی تو وہ شخص کھسک گیا۔

مرجاؤں گی "

اب وہ رونے کے قریب ہو گئی تھی،

بارش میں تیزی آنے لگی تھی، ہواؤں کے زور سے درخت رکوع میں جلنے لگے تھے۔ دوکانوں کے بورڈ ٹوٹ ٹوٹ کر دھڑا دھڑ نیچے گرنے لگے تھے۔ بازار آدھا بند ہو چکا تھا۔ بجلی کی کڑک سے محسوس ہوتا تھا کہ آسمان پھٹ کر زمین پر آجائے گا۔

"طوفان آکر رہے گا۔"

اس نے کہا اور گھبرا کر بیگ اٹھالیا۔ چند قدم چلی، ٹھٹھکی، ادھر ادھر دیکھا کہ اب بھی کوئی مزدور مل جاتا تو اس کی عزت رہ جاتی ۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ البتہ ایک دوکان کے سائبان میں ایک عورت کھڑی اسے گھور رہی تھی۔ وہ معمولی سی سفید ساری پہنے ہوئے تھی۔ شکل وصورت بھی بس واجبی واجبی تھی، قد لانبا تھا، عمر بھی کوئی بیالیس پینتالیس سال کی ہوگی ۔

اس نے جلدی سے بیگ زمین پر رکھدیا

شاید بہلے جائے، مزدوری لگتی ہے ۔ اور اگر نہ بھی ہو تو پیسہ کس کو کاٹتا ہے دے دوں گی بیس پچیس روپئے۔ ذرا سی دور تو لے جانا ہے اور پھر بیگ بھی ہلکا پھلکا ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کے لئے ۔ مگر کہیں یہ اس غنڈے کی ساتھی نہ ہو۔ کسی جال میں پھنس نہ جاؤں۔ بیگ ہی لے کر بھاگ کھڑی ہو ایسے موسم میں کون مدد کو دوڑے گا ۔ نہ بابا ۔ نہ ۔ اسے نہ بلاؤ ۔ پھر؟"

دفعتاً اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوگئی ۔ وہ عورت اسی کی طرف آرہی تھی ۔ اس نے بیگ اپنے پیروں کے درمیان کرلیا۔

او مائی گاڈ " کہیں وہ غنڈا بھی نہ آجائے۔

اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دھک، دھک، دھک۔ اس نے سوچا کوئی دعا پڑھے مگر کوئی دعا یاد ہی نہیں آرہی تھی ۔

اس نے ذہن پر زور ڈالا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ بچپن میں دادی امّاں نے چوکیوں پر بیٹھا کر، دوپٹہ اڑھا اڑھا کر نہ جانے کیا کیا پڑھایا تھا۔ مگر وہ سب بھول گیا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ زندگی مزے میں کٹ رہی تھی۔ سب کچھ تھا عیش کرنے کو ایسی حالت میں بچپن میں رٹی ہوئی آیتہ الکرسی دعائے قنوت، دعائے گنج العرش، اور پتہ نہیں کیا کیا بڑی تیزی سے ذہن سے کود کر بھاگ گئی تھیں اور پھر کبھی نہ لوٹی تھیں، بلایا بھی نہ تھا، ضرورت ہی کب پڑی تھی ___ اور اب ضرورت پڑی تو۔ یعنی بہت ممکن ہے کام ہی آجاتیں ___ ویسے یہ بارش نہ ہوتی، طوفان نہ آتا یا اگر کوئی مزدور ہی مل جاتا تو پھر ضرورت ہی کیا تھی"

میڈم آپ کچھ پریشان ہیں؟"

آواز پر وہ چونکی۔

وہی عورت قریب کھڑی پوچھ رہی تھی

" ای۔ ای۔ ای عذرا کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی۔

" گھبرایئے نہیں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

عذرا نے بیگ کو قدموں کی گرفت میں لے لیا" میں۔ میں۔ میری گاڑی ___"

وہ ہکلائی۔

کیا ہوا آپ کی گاڑی کو، خراب ہو گئی ہے کیا؟"

اس عورت نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ عذرا کے دل کی دھڑکن قدرے معمول پر آگئی۔ اس نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔

اس عورت نے سر کو ساری کے آنچل سے ڈھانپ رکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی کلائیاں سونی تھیں۔ کان، ناک، گلا، سب کسی قسم کی آرائش سے خالی تھے۔ آنکھیں پیاسی پیاسی سی تھیں ــ البتہ ہاتھوں کی انگلیاں ــ "اف" عذرا نے اس حالت میں بھی انہیں دیکھ لیا اور جل گئی۔

"جیب کاٹتی ہو گی" "تبھی تو اتنی نرم و نازک اور خوبصورت ہیں۔" اس نے سوچا ــ پھر بولی

"گاڑی کو کچھ نہیں ہوا ہے۔ میرا یہ بیگ کار تک کوئی پہونچا دیتا تو میں ــ تو میں اسے پچاس روپئے دے دیتی۔"

"اس چھوٹے سے بیگ کو اٹھانے کے لئے آپ پچاس روپئے خرچ کرسکتی ہیں ــ!" اس عورت نے حیرت سے پوچھا

عذرا الجھ گئی

"تو کیا میں اٹھاؤں، پچاس کیا سو روپئے دے دوں گی۔ عزت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ مگر کوئی ملتا ہی نہیں۔ کمبخت لگتا ہے کسی کو روپئے کی ضرورت نہیں" ضرورت تو آپ کو نہیں ہے میڈم۔ ورنہ ایک ذرا سی زحمت سے بچنے کے لئے آپ سو روپئے پھینکنے کے لئے تیار ہیں۔ خیر۔ چلئے میں پہنچا دوں۔

وہ عورت مسکرائی

اس نے بیگ اٹھا لیا

کہاں ہے آپ کی کار" اس نے بیگ سر پر رکھتے ہوئے پوچھا

"چلو میرے ساتھ" عذرا بولی

دونوں چلنے لگیں۔ عذرا کے دل میں خدشہ اب بھی تھا۔ وہ سوچنے لگی۔

کہیں یہ لے کر بھاگے نہ۔ کہیں اس غنڈے کی ساتھی نہ ہو۔ یا کسی دوسرے ٹھگ سے ساز باز ہو اور وہ راستے میں جھپٹ پڑیں۔ خیر جہنم میں جائے بیگ اور اس میں رکھی ہوئی چار ہزار روپے کی چیزیں۔ میں تو اب نہ رکوں گی۔"

دونوں خاموشی سے چلتی رہیں۔ احتیاطاً وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی رہی داہنے بائیں بھی نظر ڈالتی جاتی کہ کہیں اچانک حملہ نہ ہو جائے۔ جیسے جیسے وہ کار کے قریب ہوتی گئی۔ اس کے چہرے پر بشاشت واپس آتی گئی، دماغ کی نسیں ڈھیلی ہوتی گئیں، اور آنکھوں میں چمک آتی گئی، وہ اب بالوں کو درست بھی کرنے لگی تھی۔ ساری کے پلو کو بھی ٹھیک کرنے لگی تھی، چال میں بھی عام دولت مند عورتوں کی ادا پیدا ہو گئی تھی۔ وہی خشونت، وہی جلال، وہی دنیا کو اپنی جوتیوں پر رکھ کر اچھال دینے کی دبی دبی خواہش، اور ہر راہ گیر کی نظروں کو اپنے جسم پر پیوست کر لینے کی میٹھی میٹھی تمنا، اور جو کوئی نہ دیکھے اسے گولی سے اڑا دینے کی آرزو ـــــ

کار کے پاس وہ آ کر رک گئی، جلدی سے پچھلا دروازہ کھولا۔ اس عورت نے بیگ سیٹ پر رکھ دیا۔ اس نے کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور جھٹ سے اگلا دروازہ کھولا تیزی سے اندر داخل ہوئی اور سیٹ پر ڈھیر ہو کر کراہی۔ اوہ مائی گاڈ۔ آئی واز نیرلی ڈیڈ۔ O. MY GOD I WAS NEARLY DEAD - اس وقت تک ہواؤں کا زور کم ہو گیا تھا مگر بارش تیز ہونے لگی تھی، بجلی کی کڑک اور چمک البتہ فضا میں وحشت اب بھی پھیلا رہی تھی۔

وہ عورت باہر کھڑی بھیگ رہی تھی۔

عذرا نے جلدی سے پرس کھولا، پچاس پچاس کے دو نوٹ نکالے۔ اور اس عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"لو اپنی مزدوری"

عورت مسکرائی اور ہاتھ بڑھا کر روپئے لے لئے۔ عذرا چند سیکنڈ یوں ہی بیٹھی رہی۔ اس نے سوچا۔

"اگر پچاس دیا ہوتا تب بھی ٹھیک تھا۔ یہ لے لیتی۔ پچاس ہی کافی تھا اس کے لئے، سو تو بہت ہو گئے مگر اس نے انکار بھی نہ کیا۔ لالچی ہے۔ کوئی معقول عورت ہوتی تو اتنا نہ لیتی۔ بس چند قدم ہی تو لانا تھا اور وہ بھی ایک چھوٹا سا بیگ۔

ہوں — چھوٹے لوگ جو ٹھہرے۔

اس نے دروازہ بند کیا اور کار اسٹارٹ کر دی چند گز جانے کے بعد اس نے عقبی آئینہ میں دیکھا۔ وہ عورت جھک کر کچھ اٹھا رہی تھی۔ اس نے آئینہ ایڈجسٹ کیا۔ اس کا وزٹنگ کارڈ تھا شاید پرس کھولتے وقت گر گیا تھا

"اب یہ ایک روز گھر پر پہنچ جائے گی۔ کچھ مانگنے والگنے"

وہ بڑبڑائی اور کار کی رفتار تیز کر دی —

رات کے دس بج رہے تھے، ڈنر ہو چکا تھا۔

"آؤ تمہیں ایک کہانی سناؤں"

عزیز نے اپنے آٹھ سالہ بچے کو بلا کر اپنے پاس مسہری پر لٹا لیا۔ اس کی بیوی صوفہ پر بیٹھی کچھ سی رہی تھی۔

وہ بھی متوجہ ہو گئی۔

کئی سال پہلے کی بات ہے ___ عزیز نے کہانی شروع کی ___ "ایک لڑکا جو تم سے عمر میں تھوڑا ہی بڑا تھا، سوتیلی ماں کے ظلم سے تنگ آکر بمبئی بھاگ کر آیا۔ پہلی رات ریلوے اسٹیشن پر گزار دی، دوسری فٹ پاتھ پر اور اس کے بعد ان گنت راتیں آئیں مگر فٹ پاتھ کی سخت زمین اس کی پیٹھ سے نہ چھوٹی۔ پہلے فاقے پر فاقے کئے، پھر بھیک مانگا، چند مہینوں بعد وہ گداگری سے آگے بڑھا۔ اور بوٹ پالش کے پیشہ تک پہونچا، چرچ گیٹ ریلوے اسٹیشن کے باہر وہ آنے جانے والے لوگوں کے جوتے چمکانے لگا ___ پھر وہ فٹ پاتھ سے اٹھا اور ورلی ناکے ایک جھونپڑے میں پہنچ گیا وہاں سے وہ کہیں اور گیا۔ پھر کہیں اور پھر کہیں اور ......"

"کہاں کہاں گیا پاپا"

لڑکے کو یہ شارٹ کٹ پسند نہ آیا۔ اس نے عزیز کی بات کاٹ لی۔

عزیز نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بولا۔

"بس وہ مختلف کام کرتا رہا، کبھی یہ کام کبھی وہ کام"

کچھ مہینوں اس طرح کا دھندا کچھ مہینوں اُس طرح کا دھندا ___ کچھ سال اس چیز کی تجارت کچھ سال اس چیز کی تجارت ___ غرضیکہ ...."

"ہم یہ کہانی نہ سنیں گے۔" ___ لڑکا چڑھ گیا ___ "آپ ٹھیک سے

بتاتے نہیں۔ اس کی۔ اُس کی۔ کہیں اس طرح کہانی سنائی جاتی ہے۔"

تم سنو تو"۔ عزیز نے بیٹے کو چمکارا ۔ بڑی لمبی کہانی ہے۔ ۲۷ کتابیں
اس شخص پر لکھی جا چکی ہیں۔ ۸ فلمیں بن چکی ہیں۔ اب بھلا اتنی لمبی کہانی تفصیل
سے کس طرح سناؤں بس یہ سمجھ لو کہ چالیس سال تک وہ گرتا پڑتا رہا اور آخر کار۔
اتنا کہہ کر عزیز یکایک چپ ہو گیا۔
"پھر؟ لڑکا اس کے سینے پر چڑھ گیا ۔" جلدی بتایئے"
عزیز نے اسے اپنے سینے پر لٹا لیا۔
جس دن اس کی پچاسویں سالگرہ تھی وہ بارہ شپنگ کمپنی کا مالک تھا
ملک کی ہر بڑی کمپنی میں وہ شریک تھا، دنیا کے ہر بڑے شہر میں اس کی
کوٹھیاں تھیں۔ تین ہوائی جہاز اس کے ذاتی ہوائی اڈے پر ہمیشہ کھڑے
رہتے تھے، اور ملک کی سیاست اس کی انگلیوں کے اشارے پر ناچتی تھی"
"گپ" عزیز کی بیوی بولی۔
"ممی، آپ چپ رہیئے۔ ہاں پاپا پھر؟" لڑکا باپ کے سینے پر بیٹھ
گیا۔
"پھر دو سال پہلے وہ مر گیا۔"
چہ، چہ، لڑکے کو افسوس ہوا ۔ پھر؟
اس کی موت کے بعد اس کی بیوی نے ۔ وہ دلہن بن کر ورلی کے
جھونپڑے میں آئی تھی۔ کاروبار کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی"
پھر دو سال کے اندر اس کے پاس ایک اور شپنگ کمپنی آگئی یعنی کل

تیرہ ہو گئیں۔ ہوائی اڈے پر ایک اور ہوائی جہاز کھڑا ہو گیا۔ ملک کی سیاست اسکے

ابروؤں کی جنبش سے لڑکھڑانے لگی۔"

"گپ" عزیز کی بیوی پھر بولی۔

لڑکا خفا ہو گیا۔

آپ بور مت کریئے ممی، آپ کی سمجھ میں نہیں آتا تو چپ رہیئے۔

وہ عزیز کے سینے سے اتر کر بستر پر بیٹھ گیا۔ بولا' پھر پاپا"

جانتے ہو وہ کون تھے' عزیز نے پوچھا۔

بتایئے نا، لڑکے نے جلدی سے کہا

میری کمپنی کا مالک رشید کرمانی اور اسکی بیوی سلمیٰ کرمانی۔

عزیز کی بیوی نے اپنی انگلی میں سوئی چبھو لی، خون کا ننھا قطرہ نمودار

ہو گیا اور وہ سی سی کرنے لگی۔

" پھر؟ لڑکے نے اپنے باپ کو جھنجھوڑا۔

پھر یوں ہوا کہ کل سلمیٰ کرمانی اس مرتبے پر پہنچ گئی، جہاں پیغمبروں کی رسائی ہوتی ہے

" وہ کیسے پاپا، لڑکا کھڑا ہو گیا۔

اس نے تمہاری ممی کا بیگ اپنے سر پر اٹھا کر ان کی کار میں رکھا ہے۔ سمجھے۔

تمہاری ممی کا بیگ جس کا شوہر اس کی ایک کمپنی میں تیسرے درجے کا نوکر ہے آج آرمنس

میں وہ میرے پاس خود آئیں اور ہنس کر کہا۔ مسٹر عزیز ایک لطیفہ سنو"

عزیز نے جیب سے پچاس پچاس کی دو نوٹیں نکالیں اور انہیں اپنی بیوی

کی طرف پھینکتے ہوئے نفرت سے بولا۔

انہیں سنبھال کر رکھنا' ایک فرشتے نے چھو کر انہیں پاک کیا ہے

عجیب بات ہے

تینوں سبز پوش گردن جھکائے بڑی دیر سے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ آخر کار ان میں سے ایک نے خاموشی توڑی۔

"عجیب بات ہے۔"

دوسرے نے اپنی گردن موڑتے ہوئے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور پوچھا۔

"کیا عجیب بات ہے؟"

اس پر پہلا بولا۔

"عجیب بات یہ ہے کہ پورے شہر میں قیامت برپا ہے۔ جدھر دیکھو قتل و غارت گری، آتش زدگی، لوٹ مار، اور وہ سب کچھ جو تہذیب و انسانیت کی نفی ہے، جاری ہے مگر عجیب بات یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ کون کس کو مار رہا ہے، کس کی املاک لوٹی جا رہی ہے اور کیوں اور لٹیرا کون ہے۔

"گھر کس کا جل رہا ہے۔ اور جلانے والا کون ہے۔"

پہلے کی بات سن کر تیسرے نے کہا۔

یہ سوال تو میرے دل میں بھی تھا۔"

اس پر پہلے نے تیسرے کو خفگی سے دیکھا "تمہارے دل میں تو سوال ہی سوال ہوتا ہے۔ مگر جواب ایک بھی نہیں ہوتا۔ بتاؤ یہ ہنگامہ کون کر رہا ہے؟"

تیسرے کو جواب نہ بن پڑا تو وہ سر کھجلانے لگا۔ اس پر دوسرا بولا

" بات واقعی عجیب ہے ہمیں اب اندازہ ہوا کہ کسی کو پتہ نہیں کہ کون کس کا دشمن ہے۔ اور کیوں ہے؟"

اتنی بات ہو چکی تو تینوں پھر خاموش ہو گئے اور بڑی دیر تک سر نہوڑائے اپنے دل کی دھڑکنیں سنتے رہے۔ اس اثنا میں ایک دھماکہ ہوا تو تینوں نے چونک کر اپنی اپنی گردنیں اٹھائیں۔

یہ آواز کیسی ہے؟" تیسرے نے پوچھا۔

اس پر دوسرے نے اُسے جھڑک دیا۔

" اتنے دنوں سے یہ آواز سن رہے ہو۔ پھر بھی پوچھتے ہو یہ آواز کیسی ہے"

" تو یہ وہی آواز ہے جس کے سننے کے ہمارے کان عادی ہو چکے ہیں" تیسرے نے گویا سمجھتے ہوئے کہا۔

" اور کیا "

" مگر یہ شور" تیسرے نے پھر پوچھا۔

باقی دونوں نے بھی کان کھڑے کر لئے۔

شاید گھر جلائے جا رہے ہیں۔ اور انسان مارے جا رہے ہیں؛" پہلے نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "یہ آوازیں بھی مانوس ہوتی جا رہی ہیں۔"

"ہم جو اتنے دنوں سے سن رہے ہیں اجنبیت جاتی رہی ہے۔" دوسرے نے پہلے کی ہاں میں ہاں ملائی ۔

"مگر کون کس کا گھر جلا رہا ہے۔" اس نے پوچھا۔ اس پر پہلا بولا۔

"یہی بات تو عجیب ہے۔"

اتنا کہہ کر اس نے گھور کر تیسرے کو دیکھا۔ جو ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔

"لیکن تو کیوں مرا جا رہا ہے۔ اس نے تیسرے کو ڈانٹا۔ اس پر تیسرے نے منمناتے ہوئے کہا۔

آج یہ آوازیں قریب سے آ رہی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ ہماری بغلوں سے نہ آنے لگیں۔"

"مگر ہمیں کس کا ڈر۔" دوسرا پر اعتماد لہجہ میں بولا۔

"سامنے والے سرخ پوشوں سے تو ہمارے گہرے مراسم ہیں۔ صدیوں سے ان کے پرکھوں نے ہمارے اجداد کی پلیٹوں میں ایک ساتھ کھانا کھایا ہے۔ اور ہم نے ان کی بہو بیٹیوں کے آنچلوں کی نگہبانی کی ہے۔ پھر ہمیں اپنی بغلوں سے ڈر کیسا۔"

"لیکن جہاں سے آوازیں آ رہی ہیں۔ کیا وہ لوگ تاریخ سے نابلد ہیں۔" تیسرے نے بڑی تلخی سے پوچھا۔

"پتہ نہیں" دوسرا کھسپھسا کر رہ گیا۔ جیسے غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔

اس پر پہلا بڑبڑایا۔ "عجیب بات ہے"!

"تیسرے نے پہلے کو غور سے دیکھا۔ بولا۔

" اور اسی لئے مجھے اپنی بغلوں سے خوف محسوس ہونے لگا ہے کہ کہیں ان میں سے خنجر نہ نکل آئے۔ یا آتشیں گولے نہ برآمد ہو جائیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں اپنے آپ سے ڈرنا چاہیئے کہ پتہ نہیں کب ہم اپنے آپ کو قتل کر دیں یا اپنی ماں بہنوں کی عزت لوٹ لیں۔"

تیسرے کی بات سن کر دوسرے کا لہجہ دوبارہ سخت ہو گیا۔

"تم بزدل ہو، اور اتنا ہی نہیں تم انسانی قدروں کے منکر بھی ہو"

" یہ سچ ہے کہ میرا اعتماد متزلزل ہو گیا ہے۔" تیسرے نے دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ " لیکن تمہیں اپنی بغلوں پر واقعی بھروسہ ہے؟"

تیسرے کا سوال دوسرے کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اور اسکے ہونٹ ایک دوسرے سے چپک گئے۔ شاید وہ ہاں اور نا کے درمیان مصلوب ہو گیا تھا۔ اس پر پہلا پھر بڑبڑایا۔

"عجیب بات ہے"!

اس کے بعد تینوں اپنی اپنی سوچوں کے قیدی بن گئے۔ دور سے بچاؤ، مارو، جلاؤ کی آوازیں ایک ساتھ آتی رہیں۔ فضا دھماکوں سے دہلتی رہی اور آگ کے شعلے لپکتے رہے۔ دھوئیں کے مرغولے اوپر ہی اوپر اٹھ کر ستاروں کی آنکھیں بند کرتے رہے۔ اسی وقت "کھٹائیں"

کی آواز آئی۔"

تینوں نے چونک کر اپنی جھکی مڑی گردنیں اوپر اٹھائیں۔

"یہ آواز تو بہت قریب سے آئی ہے۔" تیسرا گھبرا کر کھڑا ہوگیا اور دوسرے پر نظریں جماتے ہوئے تلخی سے بولا۔

"شاید سرخ پوشوں نے اس پلیٹ میں سوراخ کر دیا۔ جس میں ان کے پرکھوں نے ہمارے اجداد کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے حسین شامیں گزاری تھیں۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا۔" دوسرے کے لہجے میں گھبراہٹ کے ساتھ حیرت بھی تھی۔

"تمہیں تو مرنے کے بعد بھی اپنی موت کا یقین نہ ہوگا۔" تیسرے نے نفرت سے کہا۔

"میں کیسے یقین کر لوں کہ سرخ پوشوں نے حملہ۔۔۔۔"

اسی وقت بندوقوں کے دھڑ دھڑ چھوٹنے کی آواز بالکل پاس سے آنے لگی۔ تو دوسرے کی آواز اندر ہی اندر گھٹ کر مر گئی۔

تیسرا چلایا۔

"بھاگو سرخ پوشوں نے حملہ کر دیا"

تمام گھروں کے دروازے کھٹا کھٹ بند ہونے لگے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ان میں سے دھواں اور شعلے ساتھ ساتھ اٹھنے لگے۔ کچھ بلندی تک دونوں کا ساتھ رہا۔ پھر دھوئیں نے اوپر اٹھ کر ساتوں آسمانوں کے

دروازوں کو بند کر دیا۔ اور ان کا رشتہ زمین سے منقطع کر دیا۔ جلتے ہوئے مکانوں، سامانوں اور املاک کی چٹاخ چٹاخ، بھنتے ہوئے جسموں کی چرچراہٹ چیختے چلاتے اور بلبلاتے ہوئے انسانوں کی وحشت ناک فریادیں زمین پر ہی گونج کر رہ گئیں۔ اوپر جا ہی نہ سکیں۔ اور جب جلے ہوئے گوشت کی چرائند سے ہوائیں اچھی طرح بوجھل ہو گئیں اور مکانوں کی حدیں ٹوٹ گئیں۔ — خلاء میں دھواں تحلیل ہونے لگا اور چھتوں کے بڑے بڑے سوراخوں سے آسمان نظر آنے لگا۔ اور کہیں کہیں ستارے بھی ڈرے سہمے دکھائی دینے لگے۔ اور آتش کدہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ تو پہلے نے اپنی قبر سے جھانک کر آواز دی۔

"ارے کوئی ہے"

دوسرا اپنی پناہ گاہ سے اٹھا" میں یہاں ہوں۔"

تیسرا بھی بول پڑا — "میں بھی تمہارے پاس ہوں گو کہ معدوم ہوں"

پہلا اپنی قبر سے باہر نکل آیا۔ اور ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"چلو اچھا ہوا ہم تینوں بچ گئے کہ تاریخ میں ایک حیرت ناک بات کا اضافہ ہو سکے۔ کہ ہماری رہائش گاہوں پر جن کے چھجوں پر سفید کبوتر رہا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے حملہ کیا تھا وہ سرخ پوش نہ تھے وہ تو اپنی پناہ گاہوں میں مشرق کی طرف منہ کر کے امن کی دعائیں مانگ رہے تھے"

"پھر وہ کون لوگ تھے؟" دوسرے اور تیسرے نے اپنی پناہ گاہوں

سے نکلتے ہوئے ایک ساتھ پوچھا۔

"وہ خاک پوش تھے،" پہلے نے بتایا۔

اس انکشاف پر وہ دونوں سناٹے میں آ گئے۔ ان کی سٹی ہی گم ہو گئی
چند لمحوں تک وہ تینوں اپنی اپنی جگہوں پر ساکت کھڑے رہے۔ پھر پہلا بولا
"اب چلو اپنے گھروں کی راکھ کریدیں۔ اگر کچھ ہڈیاں بچ گئی ہوں۔
تو انھیں احترام کے ساتھ دفن کر دیں۔ اور اپنے بازوؤں پر زیتون کے تیل کی
مالش کریں کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے یا ڑھوں کو فصل کھاتے ہوئے دیکھ لیا
ہے۔ اور اب ہمیں بات عجیب نہیں لگتی ـــ

تلافی

اس نے جیسے ہی میری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور کھینچ کر ایک تھپڑ مار دیا۔

" بدمعاش جیب کاٹتا ہے!"

بس کے مسافر چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ " مارو سالے کو" کچھ لوگ چیخے۔ دو ایک تو مارنے کے لئے لپکے بھی۔ یہ دیکھ کر کنڈکٹر دھاڑا " آپ لوگ اپنی اپنی جگہ پر رہیں، ہنگامہ نہ کریں۔ بس کہیں رکے گی نہیں سیدھے پولس اسٹیشن جائے گی۔ اس کو اندر کرنا ہے" اس نے پاکٹ مار کو ایک موٹی سی گالی دی ــــ

میں ایک ہاتھ سے بس کی چھڑ اور دوسرے ہاتھ سے پاکٹ مار کی کلائی پکڑے کھڑا تھا۔ وہ ۱۸/۱۹ سال کا دبلا پتلا لڑکا تھا۔ بل باٹم اور

اور فل بوشرٹ پہنے تھا، بال بڑھے ہوئے تھے، ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ دیکھنے میں کوئی طالب علم لگ رہا تھا وہ بغیر مزاحمت کئے گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا اس کے چہرے پر شرمندگی عود کر آئی تھی۔ وہ جھینپا جھینپا سا لگنے لگا تھا۔ " بہت ممکن ایکٹنگ رہی ہو" میں نے سوچا شاطر گرہ کٹ پکڑے جانے پر ایسا ہی کرتے ہیں۔

پھر بھی اس کی بھولی شکل، پُرخجالت چہرہ، شرمندہ آنکھیں اور جھکی گردن دیکھی تو فوراً پسیج گیا۔

مجھ سے غلطی ہو گئی۔ دراصل اس لڑکے کی کتاب میرے پہلو میں چبھی۔ تو ایسا محسوس ہوا کہ اس کا ہاتھ میری جیب تلاش کر رہا ہے۔ کچھ دن پہلے اسی بس میں میری جیب کٹ گئی تھی۔ تب سے میں احتیاط برتتا ہوں ضرورت سے زیادہ محتاط آدمی سڑی ہوتا ہی ہے۔۔۔۔ میں سراسر جھوٹ بول گیا اور گرہ کٹ کی کلائی چھوڑ دی۔

" سالا پاگل ہے، بے مجول میں ہڑبونگ کر دی۔"

ایک کونے سے آواز آئی اور سب ہنس پڑے۔ اتنے میں میرا اسٹاپ آگیا۔ میں بس سے اترا تو وہ لڑکا بھی میرے ساتھ اتر گیا۔ میں اسے نظرانداز کر کے آفس کے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ تو اس نے پکارا۔۔۔۔۔۔۔ "سنئے"۔

میں رک گیا وہ میرے قریب آیا جیب سے ایک پرس نکالا۔ اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "

" آپ کا پرس "

میں نے جلدی سے اپنی جیب ٹٹولی ۔ وہ خالی تھی ۔ " تم نے یہ حرکت کب کی "۔
اپنا پرس لیتے ہوئے میں نے سختی سے پوچھا ۔

" جب آپ بس سے اتر رہے تھے " وہ مسکرایا ۔

بہت ہی تیز چبھتی ہوئی مسکراہٹ ،

عجیب آدمی ہو میں نے تمہیں پٹنے سے بچایا ۔ تمہاری خاطر جھوٹ بولا ۔ گالی سنی ،
اور تم نے پھر وہی حرکت کی اور وہ بھی میرے ہی ساتھ "

کیا کروں سر ۔ آپ کا بٹوہ صاف دکھائی پڑ رہا تھا ۔ میری انگلیوں میں کھجلی
ہونے لگی تھی ۔ کنٹرول تو بہت کیا مگر ـــ وہ پھر مسکرانے لگا ۔

" شرم نہیں آتی تم کو ـــ کیا نام ہے تمہارا ؟ "

" رشید احمد "

" تم یہ گرا ہوا دھندہ کیوں کرتے ہو ؟

" پیٹ کے لئے "

" پیٹ بھرنے کے لئے تمہارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں "

" ہے پہلے وہی کرتا تھا "

" کیا کرتے تھے ؟ "

" صاحب لوگوں کو شراب سپلائی کرتا تھا ۔ بابو کے اڈے سے ،
وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور میں جل گیا ۔

" تم کمینے ہو ۔ تمہاری خصلت ہی ایسی ہے ۔ تم لوگ سدھر نہیں سکتے
میں اور بہت کچھ کہتا مگر اسی وقت ایک بس آ کر اسی بس اسٹاپ

پر رک گئی۔ رشید نے منہ سے سیٹی بجائی۔ مجھے ٹاٹا کہا اور دوڑ کر بس میں گھس گیا۔

"مردود"

میں نے نفرت سے کہا اور آفس کمپاؤنڈ میں داخل ہوگیا۔

اس واقعہ کے بعد تین سال تک میں اس شہر میں رہا اور اسی بس سے مستقل آفس جاتا رہا۔ مگر رشید پھر نہ ملا۔ میرا ڈپوٹیشن پیریڈ ختم ہوا۔ تو احمد آباد واپس آگیا اور اس جیب کترے کو بالکل بھول گیا۔

مجھے احمد آباد آئے ہوئے کوئی ایک ماہ ہوئے تھے ایک دن تین دروازہ سے گذر رہا تھا کہ "سر" کی آواز سے چونکا۔ مڑ کر دیکھا ۲۱/۲۲ سال کا ایک لڑکا میری طرف بڑھا چلا آرہا ہے۔ قریب آکر وہ بولا،

سر آپ نے مجھے پہچانا۔" اور مسکرانے لگا۔ میرے ذہن میں اس کی مسکراہٹ بجلی کی طرح کوندی۔

"رشید" میرے منہ سے نکلا۔

"جی سر"

بھئی تم خوب ملے" اچانک اس سے یہاں مل کر مجھے خوشی ہوئی۔

"آپ یہاں کیسے آئے سر۔ اس نے پوچھا

"میرا تبادلہ ہوگیا ہے۔ مگر تم"؟ تمہارے دھندے کا کیا حال ہے۔ احمد آباد تو بڑا شہر ہے خوب چلتا ہوگا۔" اتنا کہہ کر میں مسکرانے لگا۔

"میں نے وہ کام چھوڑ دیا ہے۔ اب دوسرا کرتا ہوں"

"شراب سپلائی کرتے ہو؟" مجھے اس کی کہی ہوئی بات یاد آگئی۔ وہ ہنس پڑا
نہیں سر۔ کھیل کی لاری لگاتا ہوں"۔ اس نے فٹ پاتھ پر کھڑی ایک لاری کیطرف
اشارہ کیا۔

"گڈ" رہتے کہاں ہو؟"

"یہیں خاص بازار میں چلئے آپ کو اپنی کھولی دکھاؤں۔"

میرے پاس موقعہ تھا۔ تیار ہوگیا۔ اس نے لاری اپنے ساتھی کے سپرد کی
اور مجھے لئے ہوئے مختلف گلیوں سے گزرتا ہوا ایک دو منزلہ مکان کے پاس
پہنچ کر بولا۔ اسی میں دوسرے مالے پر میرا کمرہ ہے۔
۔ آئیے"

ہم دونوں اوپر گئے۔ ایک کمرے کے سامنے پہونچ کر وہ رک گیا۔ اور
دروازہ پر دستک دی۔

"اور کون رہتا ہے تمہارے ساتھ" میں نے پوچھا مگر اس سے پہلے کہ
وہ کچھ کہتا دروازہ کھل گیا۔ سامنے نہایت خوبصورت ۱۷/۱۸ سال کی لڑکی
کھڑی تھی۔ شباب کی تازگی اور بالیدگی اس کے روئے گل گوں پر مچل رہی
تھی۔ اس نے سفید ساری اور پیلے رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کا
رنگ شہابی اور نکھرا کتابی تھا، سنہرے بال شانے پر بکھرے تھے وہ
ہرنی جیسی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

"یہ تمہاری بیوی ہے۔ میں نے رشید سے پوچھا۔

"نہ نہ نہ نہ یہ میری بہن ہے" وہ جلدی سے بول پڑا۔

اور میں شرمندہ ہوگیا۔ لڑکی مسکرائی، بڑی دلفریب مسکراہٹ۔ موتی جیسے چمکدار دانت، پتلے پتلے نازک ہونٹوں سے جھلکنے لگے۔ رشید نے اس سے میرا تعارف کرانا چاہا۔

"آپ ہیں جناب —"

عظیم عثمانی" میں نے اس کی مشکل دور کردی۔

"تسلیم" لڑکی نے سر تھوڑا خم کیا اور ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

"تشریف لائیے۔"

ہم اندر داخل ہوئے چھوٹا سا کمرہ تھا۔ بہت معمولی سامان تھے اس میں۔ ایک طرف فرش پر بستر لگا تھا وہیں دیوار کے قریب لکڑی کی ایک میز اور ٹن کی کرسی رکھی تھی۔ دوسری طرف اسٹو اور پکانے کھانے کے سامان تھے۔ رشید نے مجھے کرسی پیش کی اور خود فرش پر لگے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کی بہن فوراً گلاس میں پانی لائی۔ پانی پینے کے بعد میں رشید سے مخاطب ہوا۔

"تم یہاں کب آئے؟"

اس نے اچٹتی ہوئی نظر اپنی بہن پر ڈالی جو اسٹو کے پاس بیٹھ کر اپنے ناخن کریدنے لگی تھی۔ پھر بولا۔ ہمیں ایک حادثہ یہاں لے آیا۔ جس دن آپ سے ملاقات ہوئی تھی اسی دن شام کو تین نمبر والی بس میں مجھے ایک کمزور دبلا پتلا ادھیڑ عمر کا ایک آدمی مل گیا۔ کپڑوں سے وہ کسی پرائیویٹ آفس کا چپراسی لگ رہا تھا۔ مہینہ کی پہلی تاریخ تھی تنخواہ کے روپئے

اس کی جیب میں تھے - یہ مجھے معلوم ہوگیا تھا۔ میں نے اسے اپنی زد میں لے لیا۔ اور جب دوسرے بس اسٹاپ پر اترا تو اس کا پرس میرے پاس تھا۔

اتنا کہہ کر وہ چپ ہوگیا - لڑکی گردن جھکائے بیٹھی رہی - کمرے میں مکمل سکوت تھا - ہوا بند ہونے کی وجہ سے گھٹن سی محسوس ہورہی تھی - چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر اس کی آواز آئی -

کاش کہ مجھ سے یہ حرکت نہ ہوئی ہوتی تو آج وہ زندہ ہوتا -"

"کیا وہ مرگیا؟" میں نے چونک کر پوچھا

"ہاں مجھے دوسرے دن معلوم ہوا کہ جب وہ اپنے بس اسٹاپ پر اترا اور اسے پتہ چلا کہ اس کی جیب کٹ گئی تو وہ وہیں گرا اور.... مرگیا"

"اوہ" میرے منہ سے نکلا - پھر؟

"اس کی موت کی خبر سن کر میرے دل کو شدید دھچکا لگا - میں نے پولیس اسٹیشن سے اس کے گھر کا پتہ لیا اور وہاں پہونچ گیا۔ کھپریل کا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا - اس کے شکستہ در و دیوار سے مفلسی ظاہر تھی - ماحول پر بے بسی اور اداسی چھائی ہوئی تھی -

میں اندر داخل ہوا - وہاں کچھ عورتوں کے گھیرے میں ایک لڑکی نیم بے ہوشی کے عالم میں بستر پر پڑی تھی - اسی چپراسی کی لڑکی - باپ کے ساتھ اس کا سب کچھ چلا گیا تھا - اس دنیا میں وہ اکیلی بے یار و مددگار رہ گئی تھی - میں تھوڑی دیر اسے دیکھتا رہا پھر جانے کیا ہوا میری گناہگار آنکھوں سے جھر جھر آنسو گرنے لگے -

مجھے روتا دیکھ کر وہ نیم بے ہوش لڑکی اٹھ بیٹھی۔ اور پوچھا میں کون ہوں
میں نے بتایا کہ میں وہی گرہ کٹ ہوں جس نے اس کے باپ کی جیب کاٹی
تھی۔

میں نے چاہا کہ وہ دوڑ کر آئے میرے بالوں کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر زور
زور سے کھینچے چیخے، چلائے اور دانت کاٹ کاٹ کر مجھے لہولہان کر دے۔
مگر سر۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ اس نے نہ تو مجھے گالی دی نہ مارا
نہ میرے منہ پر تھوکا نہ چیخی نہ چلائی۔ خاموشی سے اٹھی میرے پاس آئی
اور میرے کندھے پر سر رکھ کر رو پڑی"۔

اتنا کہہ کر رشید خاموش ہو گیا۔ مگر اس کی خاموشی مجھے سخت گراں
گزری میں پوری کہانی سننے کے لئے بے چین تھا۔ جلدی سے پوچھا ”پھر“
پھر مجھے اس شہر سے وحشت ہو گئی۔ اور اس دھندے سے نفرت
ہو گئی۔ دونوں چھوڑ دیا۔ اور اس یتیم کو لے کر یہاں چلا آیا۔ اس نے بات
یکایک ختم کر دی۔

میں نے چونک کر اسٹو کے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا۔ کتنا بڑا
کام کیا تھا اس جیب کترے نے۔ اس کے کردار کی بے مثال نجابت نے
میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مجھے اس مینارۂ انسانیت
سے آنکھیں ملانے میں شرم آنے لگی۔ اور اپنے کو ایسا اونٹ سمجھنے لگا۔
جو پہاڑ کے نیچے آکر بلبلانا بھول گیا ہو۔

اسی وقت ایک لڑکا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ رشید ہی کی عمر کا

رہا ہوگا۔ اچھی شکل و صورت کا مالک تھا۔ خوش پوش، صحت منداور دراز قد تھا اسے دیکھتے ہی رشید کھڑا ہوگیا۔

"آؤ۔ ان سے ملو۔ عظیم صاحب۔ سرکاری افسر ہیں۔"

لڑکا مسکرا کر میری طرف بڑھا۔ میں کرسی سے اٹھ گیا۔

"اور یہ سریندر ہے۔ میرا دوست۔ اے، جی آفس میں آڈیٹر ہے۔"

رشید نے مجھے بتایا۔ ہم گرم جوشی سے ہاتھ ملانے لگے۔" تو رشید بولا"۔ سر آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میں نے اپنی منہ بولی بہن کی شادی اس سے کردی ہے۔

" ارے یہ کیا ہوا۔" میرا تعصبی ذہن چیخا اتنی پیاری لڑکی کو رشید نے کیوں۔ آخر کیوں۔ کیا اسے اپنوں میں کوئی نہ مل سکا تھا۔ اس سے تو بہتر ہوتا کہ خود ہی۔ یا پھر میں۔ مگر میں کہاں تھا پھر بھی کمبخت آخر کار جیب کترے کا جیب کترا ہی نکلا۔

میں نے سریندر کا ہاتھ نفرت سے جھٹک دیا۔

رشید میری بوکھلاہٹ بھانپ گیا۔ اس کے لبوں پر وہی مخصوص تیز چبھتی ہوئی مسکراہٹ رینگ گئی۔ بولا۔

"سر" اس لڑکی کا نام شیلا ہے۔"

مجھے ایسا لگا جیسے رشید نے میرے منہ پر تھوک دیا ہو۔
میں گھٹ کر مزید چھوٹا ہوگیا۔

٭٭٭

جوٹھن

یہی شہر کا وہ خوبصورت علاقہ ہے۔ جہاں میں رہتا ہوں۔ اور یہ رہی لا بیلا بلڈنگ، اسی میں دوسری منزل پر میرا کمرہ ہے۔ آئیے۔ یہ رہا وہ کمرہ، وہ کھڑکی جو کھلی ہے نہ۔ ہمیشہ کھلی رہتی ہے، وہاں سے تین خاص چیزیں آپ آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ آئیے۔ دکھلاؤں وہ دیکھیے نیچے کتنی خوبصورت سڑک ہے، کالی، چکنی، بل کھاتی ہوئی سڑک اور اس پر رینگتی ہوئی کاریں، لمبی لمبی کاریں جن کا اگلا اور پچھلا دونوں حصّہ ایک جیسا لگتا ہے۔ نازک نازک کاریں جنھیں چھوتے ہوئے ڈر لگے کہ کہیں میلی نہ ہو جائیں۔ نیلی پیلی، گلابی کاریں جو پاس سے گزریں پھر بھی خبر نہ ہو، مگر خبر کیوں نہ ہو، ان کے گزرنے پر خوشبو کا جھونکا جو

گزرتا ہے وہ کسی کو بے خبر کیسے رہنے دے گا۔ اس کے علاوہ پچھلی سیٹ پر جو گول مٹول پلّا بیٹھا رہتا ہے وہ بھونک کر آپ کو خبردار کر ہی دے گا۔ اسی سڑک پر شام کو موٹے سیٹھوں کی نازک البیلی داشتائیں اور رشوت خور افسروں کی نو عمر بیویاں ہولے ہولے چہل قدمی کرتی ہیں۔

دوسری چیز جو آپ دیکھیں گے وہ سیٹھ جمنا داس کا بنگلہ ہے۔ ذرا دیکھئے وہ، کیسا لگتا ہے؟ لگتا ہے نہ کہ جیسے کوئی ناؤ سفید بادبان کے سہارے اپ اسٹریم کی طرف پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ اور تیسری چیز ہے وہ درخت، گل مہر کا وہ خوبصورت درخت جو جمنا داس کے بنگلے کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ہے۔ اس طرف اس لئے نہیں ہے کہ ادھر تو سرو کے لمبے لمبے درخت ہیں اور ان تینوں چیزوں کے علاوہ ایک چیز اور آپ دیکھتے اگر میں اخبار کا رپورٹر نہ ہوتا۔

اسی گل مہر کے درخت کے نیچے کوڑے کا ایک ڈھیر تھا۔ اب یہ نہ پوچھئے کہ اتنی خوبصورت جگہ پر کوڑے کا ڈھیر کیوں تھا۔ تو صاحب اسے تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔ ورنہ یہ جگہ اتنی خوبصورت کیونکر ہوتی بدصورتی ہی تو خوبصورتی کا پیمانہ ہے۔ خیر تو وہ ڈھیر تھا جہاں یوں تو دن بھر آزاد کتے، پالتو سور اور جھونپڑوں میں پلتے کالے کلوٹے فاقہ زدہ چھوکرے جن کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ پالتو تھے یا آزاد، اسے کریدتے رہتے اور آپس میں جھگڑتے رہتے۔ مگر صبح کے وقت جب سیٹھوں اور افسروں کے گھروں میں

بریک فاسٹ ختم ہوتا اور ان کے ڈائننگ ٹیبل کے نیچے کچھے ڈبل روٹی
کے ٹکڑے، مکھن کے ریپر اور پھلوں کے چھلکے پھینکے جاتے تو وہاں کا
منظر ہی کچھ اور ہوتا۔

اس کھڑکی سے میں نے وہ منظر بارہا دیکھا ہے۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ

دوپہر کے اخبار کے لیے میرے پاس کوئی میٹریل نہ تھا۔ کھڑکی کے پاس
کھڑا خلا میں کوئی مضمون تلاش کر رہا تھا کہ بوں پوں کی آواز میری
نظروں کو کوڑے کے ڈھیر پر لے گئی۔ وہاں دو کم سن لڑکے کھڑے تھے
ان میں ایک جو قدرے بڑا تھا، ہاتھ میں ڈنڈا لیے تھا۔ ان سے چند
قدم کے فاصلے پر ایک کتا اگلی ایک ٹانگ جھلاتا ہوا بے تحاشہ
چیخ رہا تھا اور پاس ہی کھڑی ایک سورنی انہیں قہر آلود نگاہوں سے دیکھ
رہی تھی۔ اسی وقت سیٹھ جمنا داس کے بنگلے سے ایک نوکر آتا
ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی
وہ ہاف پینٹ اور ہاف بوشرٹ پہنے ہوئے تھا اور جھجک جھجک
کر چل رہا تھا۔ جیسے چل نہ رہا ہو پھدک رہا ہو، اسے دیکھتے ہی چھوکرے
تالی بجانے لگے، سور دائرے میں گھومنے لگی، اور کتے نے چیخنا بند
کر دیا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ جیوں کی تیوں لٹکی رہی۔

نوکر نے سڑک پار کیا اور ایک ٹانگ اٹھا کر بنڈل کو
کوڑے کے ڈھیر پر اچھال دیا۔ بنڈل کا گرنا تھا کہ وہاں موجود تسلسل

اور حیوان ایک ساتھ جھپٹے اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس عجیب و غریب جنگ میں اوّلاً سور فاتح رہی وہ پورا بنڈل منہ میں دبا کر بھاگنے ہی والی تھی کہ دونوں لڑکوں نے اسے دبوچ لیا اور بنڈل چھین کر رفو چکر ہو گئے غم و غصہ سے سور اپنا کھو کھتن زمین پر رگڑنے لگی اور کتا اپنی ٹوٹی ٹانگ جھلاتے ہوئے پھر رونے لگا۔

مجھے مضمون مل گیا تھا۔ کیوں نہ ایک رپورٹ اس گندگی پر لکھ کر کارپوریشن کے منہ پر دے ماروں۔ میں نے سوچا اور پھر وہی کیا۔

اسی روز رات میں جب کمرے پر واپس آیا تو نوکر نے اطلاع دی کہ شام کے وقت کارپوریشن کی کوڑا گاڑی آئی تھی اور ساری غلاظت اکٹھا کر لے گئی۔ بڑی دیر تک لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوتا رہا کہ کوڑا گاڑی روز صبح و شام آیا کرے گی اور لوگ اس میں اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ ڈالیں گے اگر کسی کو ادھر ادھر گندگی پھیلاتے ہوئے دیکھا جائے گا تو امر جنسی قانون کے تحت سخت سزا دی جائے گی۔

میں اپنی کامیابی پر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

گو یہ بات الگ ہے کہ میں اس کے بعد کبھی مسکرا بھی نہ سکا۔

دوسری صبح ٹیلیفون ایکسچینج کا ۹ بجے والا سائرن ابھی نہیں ہوا تھا میں نے چائے پی کر سگریٹ جلائی تھی اور کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر ہلکا ہلکا کش لے رہا تھا۔

اسی جگہ جہاں ہم لوگ اس وقت کھڑے ہیں۔

اتنے میں کوڑا گاڑی کھڑ کھڑاتی ہوئی آئی۔ اور اسی گل مہر درخت کے نیچے جہاں اب تک وہ غلیظ انبار تھا کھڑی ہوگئی، آس پاس کے گھروں کے نوکر چاکر کوڑا کرکٹ لئے ہوئے نکلے اور گاڑی میں ڈالنے لگے۔

سیٹھ جمنا داس کا لنگڑا نوکر جب آیا تو وہی دونوں لڑکے درخت کی اوٹ سے تیر کی طرح برآمد ہوئے مگر جب نوکر نے جوٹھن زمین پر ڈالنے کے بجائے گاڑی میں اچھال دیا تو ان کے قدم جہاں تھے وہیں جم گئے۔

چند منٹوں بعد گاڑی چلی ان لڑکوں نے چور نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا اور جب انہیں اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ کوئی خطرہ نہیں تو وہ گاڑی کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگے۔ تھوڑی دور جاکر تو چھوٹا لڑکا رک گیا مگر بڑا لڑکا دوڑتا رہا۔ جمنا داس کے گھر کے جوٹھن کا پیکٹ سب سے اوپر پڑا ہچکولے کھا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ گر پڑے گا۔ اسی پر نظریں گاڑے وہ لڑکا بے تحاشہ دوڑ رہا تھا، گاڑی کی رفتار تیز ہوئی۔ تو اس نے بھی اپنی پوری قوت لگادی اور برابر پیچھا کرتا رہا۔ گاڑی کی رفتار اور بڑھی، لڑکا اور تیز ہوا، پیکٹ اور تیزی سے ہلنے لگا اور پھر یکایک کھل گیا اور ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا لڑھک کر سڑک پر آگرا۔

بالکل اسی کھڑکی کے سامنے جہاں اس وقت ہم کھڑے تھے۔

لڑکے نے رکنا چاہا لیکن توازن کھو بیٹھا اور منہ کے بل سڑک پر گر گیا۔ چھوٹے لڑکے نے بھی پیکٹ کو کھلتے اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے کو سڑک پر گرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس ٹکڑے کو اٹھا

کر منہ میں ٹھونس لیا، اور جلدی جلدی چبانے لگا۔ جب اچھی طرح
نگل چکا۔ اور اسے اطمینان ہوگیا کہ اس کا ساتھی اب کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔
تو اس نے مسکرا کر اپنے ساتھی کو دیکھا جو سڑک پر اوندھا پڑا تھا۔
پھر دھیرے دھیرے آگے بڑھا اور قریب پہنچ کر اسے آواز دی۔

مگر اس کا ساتھی یونہی پڑا رہا۔

اس نے دوبارہ پکارا پھر بھی وہ کچھ نہ بولا۔ تیسری بار اس نے
کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا لیکن اس نے حرکت تک نہ کی۔ عاجز آ کر اس نے اپنے
ساتھی کا ہاتھ پکڑا، اور زور لگا کر اسے سیدھا کر دیا۔

"سالے اٹھ"

مگر وہ آگے نہ بول سکا، آواز حلق میں پھنس گئی۔ چند لمحے وہ پھٹی
پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بڑی بھیانک چیخ مار کر بے تحاشہ
بھاگا اور لا بیلا کی پشت میں غائب ہوگیا۔

وہ رپورٹ اگر میں نہ لکھتا تو یہ سب کیوں ہوتا۔

سنا آپ نے؟

بابلا

نام تو اس کا کچھ اور رہا ہو گا لیکن لوگ اسے بابلا کہہ کر بلاتے تھے وہ اس بڑی بلڈنگ کے نزدیک دن بھر چکر لگاتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس بلڈنگ میں سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر۔ ڈاکٹروں کے مطب اور میڈیکل اسٹورس کے علاوہ پراویزن اسٹور بھی تھے۔ جس کی وجہ سے لوگوں کا وہاں تانتا بندھا رہتا تھا۔ کوئی سرکاری کام سے آتا، کوئی شاپنگ کے لئے، سرکاری دفاتر کے بابو لوگ اور چھوٹے بڑے افسران تو سائکل سے آتے یا زیادہ سے زیادہ کسی کے پاس اسکوٹر ہوتا۔ لیکن غیر سرکاری دفاتر کے مالکان اور ان کے سکریٹری اور منیجر اپنی اپنی کاروں سے آتے وہاں شاپنگ کے لئے آنے والے لوگوں کے پاس بھی عموماً اپنی گاڑیاں ہوتیں۔

بابلا نے خود کو ان کار والوں کی خدمت پر معمور کر دیا تھا۔ جیسے ہی

کوئی گاڑی کمپاؤنڈ میں داخل ہوتی وہ اس کے ساتھ بھاگتا ہوا پارکنگ کار تک آتا اور کار کی گرد جھاڑنے لگتا۔ لوگ منع کرتے لیکن وہ باز نہ آتا۔ اور اس سے پچیس پچاس پیسے ہتھیا ہی لیتا۔ یہی اس کا روز کا معمول تھا۔ دن بھر میں اسے پانچ سات روپے مل جاتے اور رات کو جب ساری دکانیں بند ہو جاتیں تو وہ کسی دوکان کے چبوترے پر سو رہتا اور صبح پھر ڈیوٹی پر لگ جاتا۔ اس کے ماں باپ بھی تھے اور دوسرے بہن بھائی بھی وہ لوگ قریب ہی ایک جھونپڑے میں رہتے تھے۔ اور اپنی اپنی طرح گزر بسر کرتے تھے۔ کوئی کسی کا پرساں حال نہ تھا۔ اسی لئے بابلا کو گھر کی فکر ہی نہ تھی اور نہ گھر والوں کو اس کی۔ کبھی کبھار چلا جاتا تو چلا جاتا۔ ورنہ دن رات بڑی بلڈنگ کے گرد منڈلایا کرتا اور کاروں کی گرد جھاڑا کرتا۔

بڑی بلڈنگ کے سامنے پرانے طرز کا ایک بنگلہ تھا جو اب خستہ اور غیر آباد ہو چکا تھا۔ ایک دن اس بنگلہ کو مزدور گرانے لگے تو بابلا نے ان سے وجہ پوچھی انہوں نے بتایا کہ یہاں ایک ایسا ہوٹل بنے گا جو زمین سے چار سو فٹ کی بلندی پر ہوگا۔ اور اتنا ہی نہیں وہ گھومے گا بھی، اس میں بیٹھ کر سارا شہر دیکھا جا سکے گا۔

"اچھا بابلا نے بڑی دلچسپی لی ـــــ بڑا مہنگا ہوگا، ایک مزدور بولا وہاں صرف امیر ہی جا سکیں گے . . . . . ہم غریبوں کی قسمت میں تو ڈھابے کا ہوٹل ہی لکھا ہے ـــــ اتنا کہہ کر وہ مزدور زور سے ہنس پڑا اور جب وہ اچھی طرح اپنے مقدر کا مذاق اڑا چکا تو بابلا نے اس سے پوچھا۔

کتنے دن میں تیار ہوگا۔

جتنے دن میں تاج محل بنا تھا۔۔۔ ایک بڑے میاں نے مداخلت کی۔
اس پر بابلا ان سے مخاطب ہوا اور پوچھا کہ تاج محل کتنے دنوں میں بنا تھا۔

تمہاری دو عمریں لگ گئی تھیں بیٹے۔ بڑے میاں پہیلیوں سے نکل ہی نہیں رہے تھے۔ ان کی بات بابلا کے پلے "نہ پڑی تو" وہ بولا۔ میں سمجھا نہیں

لیکن اس سے پہلے کہ بڑے میاں وضاحت کرتے یا مزید پہیلیاں بجھاتے
ایک تیسرے مزدور نے جو نسبتاً ان دونوں مزدوروں سے کم عمر تھا، بابلا کو ڈانٹ دیا۔

ابے چل ہٹ خالی کھوپڑی مغز چاٹ رہا ہے۔

بابلا دم دبا کر وہاں سے چلا آیا اور اپنے کام میں جٹ گیا۔

بنگلہ توڑنے کا کام مہینوں چلتا رہا۔ پرانی وضع کا مکان تھا، محنت ولگن سے بنایا گیا تھا۔ ایمانداری اور نیک نیتی سے معماروں نے اپنا پسینہ بہایا تھا۔ اینٹوں پر ہتھوڑے پڑتے تو چنگاریاں نکلتیں اور آواز دور دور تک فضا میں چیختی پھرتی جب مکان زمین دوز ہوگیا اور ماضی کی عظمت فرش پر ڈھیر ہوگئی تو مزدوروں اور محنت کشوں نے دور جدید کی نخوت

اٹھانی شروع کردی پہلے پیمائش ہوئی پھر بنیادیں کھودی گئیں۔ اور چند مہینوں میں ایک نئے مکان کا نقشہ زمین کی کوکھ سے نمودار ہوگیا ۔۔۔ بابلا اس عرصے میں ۔۔۔ روزانہ وہاں جاتا رہا اور طرح طرح کے سوالات مزدوروں سے پوچھتا رہا۔ وہ بڑے میاں سے زیادہ مانوس ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ اس سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔

اور اس کی تمام باتوں کا اطمینان بخش جواب دیتے تھے۔

وقت گذرتا رہا اور ہوٹل کی عمارت دن بدن بلند ہوتی گئی۔ پھر اس کے بیچو بیچ ایک ستون ابھرا اور چند مہینوں میں وہ کسی مِل کی چمنی کی طرح آسمان چھونے لگا۔ پھر اس ستون کے آخری سرے پر گنبد کی شکل کا ہال تعمیر ہوا اونچے ستون پر بنا یہ ہوٹل دور سے کسی بہت بڑے واٹر ٹینک کی طرح دکھائی دینے لگا اسے دیکھ کر ایسا بھی لگتا تھا جیسے دس منزلہ مکان نے اپنے سر پر کوئی جناتی چھتری اٹھا رکھی ہو۔ بابلا کی دلچسپی اس عجیب و غریب ہوٹل میں روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اور ایک دن اسے اطلاع ملی کہ کل سے ہوٹل کھلنے والا ہے۔

بابلا نے سوچا کہ کل سے یہ گنبد گھومے گا اور لوگ اس کے اندر بیٹھ کر طرح طرح کے کھانوں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ پورے شہر کا نظارہ بھی کریں گے۔ اسے پتہ چلا تھا کہ ایک گھنٹہ میں یہ گنبد اپنی دھری پر ایک چکر پورا کرے گا۔ اس نے چند پڑھے لکھے لوگوں کی باتیں بھی چپکے سے سنی تھیں۔ وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ ہماری زمین ۲۴ گھنٹے میں اپنی دھری پر ایک چکر مکمل کرتی ہے۔ اور یہ ہوٹل صرف ایک گھنٹہ میں کرے گا یعنی یہ ہوٹل زمین کو ۲۳ گھنٹے پیچھے چھوڑ جائے گا۔

مالک کی شان ہے۔ بابلا نے سوچا یعنی زمین سے چار سو فٹ اوپر ہوا میں لٹکا ہوٹل گھومے گا۔ ہوٹل نہ ہوا لٹو ہو گیا اس میں بیٹھ کر کیسا لگے گا۔ اس نے اپنے دل سے پوچھا مگر اس کے دل کی اڑان بھی اتنی تھی جتنی اس کے چھوٹے دماغ کی۔ بس دھک دھک کر کے رہ گیا۔

دوسرے دن پوری بلڈنگ کو سجایا گیا۔ پھر لوگ آنے لگے، بڑے لوگ پیسے والے لوگ، نیتا لوگ، افسر لوگ، اور ان کی چمکیلی، بھڑکیلی، عورتیں، بابلا نے اتنی پرشکوہ محفل اور اتنی گہما گہمی نہ دیکھی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوٹل کا پارکنگ پارک مختلف، سائز، اور ماڈل۔ کی کاروں سے بھر گیا۔ جنہیں دیکھ کر بابلا کے دماغ میں سب سے پہلا خیال یہ آیا کہ اگر ان کاروں کی صفائی پر وہ لگ جائے تو اس کی آمدنی دو گنی ہو سکتی ہے۔ اس تصوّر سے اسے بڑی مسرت ہوئی اس نے جیب سے بیڑی نکالی اسے جلایا اور مزے میں کش لیتا ہوا پارکنگ پارک کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن یہاں پر اسے پہلا دھچکا لگا۔ ایک گرجدار آواز نے اسے ڈانٹا۔

"چل بے بھاگ یہاں سے"

اس نے دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا آدمی سفید یونی فارم پہنے، ہاتھ میں موٹا ڈنڈا لئے۔ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بابلا کے ہوش اڑ گئے وہ سر پر پاؤں رکھکر بھاگا۔ اور ہوٹل کے کمپاؤنڈ سے باہر نکل گیا۔

باہر آکر اس نے غور کرنا شروع کر دیا۔ اب اس کی سوچ کے دو محور تھے۔ ایک تو یہ کہ اس گنبد میں بیٹھ کر چکر لگانے اور کھانا کھانے میں کیسا مزہ ملے گا۔ اور دوسرے وہ تمام کاریں جو روزانہ یہاں آیا کریں گی ان کی صفائی پر وہ کس طرح خود کو معمور کرے۔

ہوٹل شروع ہو گیا اور لنچ اور ڈنر کے وقت عیش پرست دولت مندوں کا تانتا بندھ گیا۔ اسے بڑی بلڈنگ کے واچ مین نے جب یہ بتایا

کہ اس لٹو ہوٹل میں ایک وقت کے کھانے کا چارج ۷۵ روپے ہے تو بابلا آنکھیں جھپکانا بھی بھول گیا۔ ایک وقت کے کھانے کے ۷۵ روپئے۔ اس نے سوچا ــــ اتنے روپئے میں تو اس کا سارا خاندان ایک مہینے تک کھاتا ہے اور اس لٹو ہوٹل میں ایک آدمی صرف ایک وقت کے کھانے کا ۷۵ روپئے دے دیتا ہے۔ یہ کیسا اندھیر ہے۔ پھر بھلا وہ اس گنبد میں کس طرح جائے گا اس کے پاس ایک ساتھ ۷۵ روپئے نہ کبھی ہوئے ہیں اور نہ ہوں گے۔

وہ مایوس ہوگیا۔ لیکن اس مایوسی میں کاروں کی گرد امید بن کر اس کے شعور پر ابھری۔ اگر ان کاروں کی صفائی کا کام اسے مل جاتا تو ایک دن میں وہ دس روپئے تک بنا لیتا۔ اور اس طرح پانچ روپئے خرچ کرنے کے بعد پانچ روپئے بچا لیتا اور پندرہ دنوں میں ۷۵ روپئے ہوجاتے۔ اور وہ لٹو ہوٹل دیکھ آتا کہ اس کے اندر آخر ہے کیا اور وہ کون سا کھانا ہے جس کی قیمت ۷۵ روپئے ہے۔

مگر اس موٹے تازے سفید یونیفارم والے چوکیدار سے اسے ڈر لگ رہا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے کئی دنوں تک اپنی بلڈنگ کے چوکیدار کو بیڑی پلائی اور چار چھ بار چائے بھی پلائی۔ پھر اس سے اپنے مطلب کی بات کہی۔ جسے سن کر چوکیدار بولا ــــ ٹھیک ہے۔ میں پارکنگ پارک کے چوکیدار سے بات کروں گا۔ مگر یہ بولو کہ میرا یا اس کا بھلا کیسے ہوگا۔ بابلا اب ۱۳ برس کا ہو چکا تھا اس کے علاوہ وہ ایسے ملک اور ماحول میں پل رہا تھا جہاں بچے رشوت کے سہارے پیدا ہوتے ہیں ــــ اسپتال میں ماں کے بستر سے لے کر قبر تک جہاں دو نمبر سائڈ بزنس اور

اور اوپری آمدنی کا سکہ بلا روک ٹوک چلتا ہو۔ ۱۳ سال کی عمر سِن رسیدہ اور تجربہ کار ہونے کے لئے کافی ہے ـــــ

وہ بات کی تہہ تک فوراً پہنچ گیا ـــ بولا

ایک کار کی صفائی کا دس پیسے تمہیں اور دس پیسے اسے دوں گا۔" تب سمجھو تمہارا کام بن گیا ـــ چوکیدار نے اس کی پیٹھ پر ایک دھپ جمائی جس کی ضرب سے بابلا نے بڑی مسرت حاصل کی۔

بات سیدھے سادے اور سمجھنے والے انداز میں رکھی گئی تھی۔ اسلئے پارکنگ پارک کے چوکیدار کو کیا مضائقہ ہوتا اس نے اپنا حساب لگایا تو اوسطاً پانچ روپے روز کے ہو رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھائے ـــ اس نے بابلا کو اجازت دے دی اور اس طرح بابلا ہوٹل کی کاروں کو بھی صاف کرنے لگا صبح گیارہ بجے تک وہ اپنی بلڈنگ کی کاروں کو سنبھالتا اور گیارہ سے ۲/ بجے تک ہوٹل کی کاروں کو ـــ پھر پانچ بجے تک وہ آفس کی کاروں کی صفائی کرتا اور اس کے بعد رات کے دس بجے تک ہوٹل کی گاڑیوں کو صاف کرتا رہتا۔ اس کی آمدنی بڑھنے لگی اور اب وہ روز کے دس بارہ روپئے کمانے لگا اور پانچ روپئے بچانے لگا۔ اسے دھن تھی کہ کس طرح وہ ۷۵/ روپئے اکٹھا کرلے۔ اور ایک بار آسمان کو چھونے والے اور دنیا کی طرح گھومنے والے اس عجیب وغریب ہوٹل کو دیکھ آئے۔

اور ایک دن جب اس نے حسبِ معمول رات کی ڈیوٹی سے فارغ ہوکر بچائی ہوئی رقم گنی تو اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی ۷۵/ روپئے پورے ہوگئے تھے۔

اور اب وہ لٹو ہوٹل میں جا سکتا تھا۔ وہاں کھانا کھا سکتا تھا، اور پورے شہر کو اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دیکھ سکتا تھا اس رات اسے نیند نہ آئی۔ ہوٹل دیکھنے کی خوشی میں وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا صبح ہوئی تو اپنے جھونپڑے میں گیا۔ نہایا دھویا اور صاف کپڑے پہن کر واپس آگیا اس دن اس نے اپنی بلڈنگ کے گاہکوں کو نہیں سنبھالا ہوٹل کی کاروں کی صفائی بھی نہیں کی، بس ادھر ادھر گھومتا رہا اور لٹو ہوٹل کو سر اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا جس کی آج وہ تسخیر کرنے والا تھا وہ رات میں وہاں جانا چاہتا تھا تاکہ شہر کی رونق اچھی طرح دیکھ سکے۔ بڑی مشکلوں سے دن کٹا اور جب ندی کی سطح پر دھند کی ردا پھیلنے لگی اور سڑکوں پر لگے بڑے بڑے گیس کے ہنڈولے اور بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے اور شاہراہیں بیدار ہو گئیں تو لٹو ہوٹل کی کھڑکیوں سے بھی چھن چھن کر روشنی نکلنے لگی۔ بابلا دھیرے دھیرے لفٹ کی طرف بڑھا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی جرم کرنے جا رہا ہو بڑی مشکلوں سے اس کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لئے اسے یہ خیال بھی آیا کہ لوٹ چلے۔ کیوں اپنی گاڑھی کمائی کا خون کر رہا ہے۔ لیکن شوق نے اکسایا اور تجسس نے حوصلہ افزائی کی۔ اور وہ آگے بڑھتا گیا لیکن جب لفٹ کے پاس پہنچا تو گراونڈ بیرے نے اسے روک دیا۔

کدھر جاتا ہے اس نے بابلا کے قمیص کی کالر پکڑلی۔

اوپر — بابلا نے گھبرا کر کہا۔

اوپر کدھر بیرے نے تمسخر سے پوچھا۔

ہوٹل میں بابلا نے خود کو بیرے کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔

ابے یہ کوئی ڈھابہ ہے کہ ایرے غیرے نتھو خیرے گھس گئے۔

بیرے نے اسے آگے پیچھے ہلایا۔

مگر میں وہاں کھانا کھاؤں گا۔ میرے پاس ۵ /۷ روپئے ہیں۔

۵ /۷ روپئے بیرے نے حیرت سے پوچھا۔

کدھر سے لایا

کمایا ہے

بیرے نے ایک طمانچہ بابلا کے منہ پر مارا۔

سالا کسی کی جیب کاٹی ہے اور بولتا ہے کمایا ہے۔

یقین نہ آئے تو واچ مین سے پوچھ لو بابلا گھگھیایا۔ بیرے نے واچ مین کو آواز دی مگر وہ کہیں نظر نہ آیا اس نے جھنجھلا کر ایک دوسرا تماچہ بابلا کے گال پر مارا اور اسے گھسیٹتا ہوا باہر لایا اور سڑک پر لا کر چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر بابلا فٹ پاتھ پر کھڑا رہا اس کے جی میں آیا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور اپنے دکھ درد کو بہا ڈالے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا اس نے اب بھی امید کا دامن نہ چھوڑا تھا اس گہری مایوسی میں واچمین روشنی بن کر ابھرا تھا اگر واچ مین گراؤنڈ بیرے کو یقین دلا دے کہ اس نے روپئے کمائے ہیں کسی کی جیب نہیں کاٹی ہے تو اب بھی کام بن سکتا ہے اور وہ لٹو ہوٹل میں جا سکتا ہے آج نہیں تو کل۔

گراؤنڈ بیرالفنڈ کے پاس واپس جاچکا تھا۔

بابلانے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ اسے زمین پر کوئی چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی اس نے جھک کر اٹھا لیا۔ لوہے کی ایک نکیلی سلاخ تھی۔ اسے انگلیوں میں گھماتا ہوا وہ چپکے سے کمپاؤنڈ میں داخل ہوگیا اور چھپتا چھپاتا پارکنگ پارک تک آگیا۔ وہ واچ مین کی تلاش میں وہاں تک گیا تھا واچ مین وہاں موجود تھا بابلانے ساری باتیں اسے بتائیں جسے سن کر وہ گھبرا گیا۔

نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔

کیوں، بابلا لوٹتا ہوا بولا

اگر گراؤنڈ بیرے کو یہ معلوم ہوگیا کہ تم پارکنگ پارک کی گاڑیوں کی صفائی کرتے ہو تو وہ ہماری شکایت منیجر سے کر دے گا اور نتیجہ میں تم تو بھگائے ہی جاؤ گے میری نوکری بھی جائے گی۔ نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ کر وہ چلتا بنا۔

بابلا کو دوسرا دھچکا لگا اور اس کا ٹوٹتا ہوا وجود بکھرنے لگا وہ اپنی بے بسی اور نامرادی پر رو پڑا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے پچھلے کئی مہینے گھوم گئے۔ کتنی محنت سے اس نے ایک ایک پیسہ جوڑ کر ۷۵/روپے جمع کئے تھے محض اس لئے کہ وہ ایک دن اس ہوٹل میں جائے گا اور سیٹھوں کی طرح جھروکے سے شہر کو جھانکتا ہوا کھانا کھائے گا۔ لیکن اس کے خواب منتشر ہو گئے۔ اور اس کی محنت وریاضت مٹی میں مل گئی۔ روپیہ ہوتے ہوئے بھی وہ زمین

سے اوپر نہ اٹھ سکا ۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی نکیلی سلاخ اب بھی موجود تھی جسے وہ غیر شعوری طور پر انگلیوں میں گھما رہا تھا ۔ دفعتاً وہ نکیلی سلاخ اس کی انگلی میں چبھ گئی ۔ اس کے منہ سے سسی کی آواز نکلی اور اسی کے ساتھ ایک خیال بجلی کی سرعت سے اس کے ذہن میں کوندا اور اس کے لبوں پر کانٹے دار مسکراہٹ اگ آئی ۔

حرامی لوگ

اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا ۔ اور بڑی پھرتی سے اپنے کام پر جٹ گیا ۔

لیکن اس بار وہ کاروں کی گرد نہیں صاف کر رہا تھا بلکہ ان کے ٹائروں میں لوہے کی نکیلی سلاخ اپنی پوری قوت سے گھسیڑ رہا تھا ۔۔

سڑک کا المیہ

چاروں طرف مہیب سناٹے کا جال تنا ہوا تھا، بارڈر سیکوریٹی فورس کے جوان ہاتھوں میں مشین گن لئے گشت کر رہے تھے۔ ان کے بوٹوں کی کھٹ کھٹ ماحول پر چھائی "دہشت اور سراسیمگی میں اضافہ کر رہی تھی۔ وقفہ وقفہ سے فائرنگ کی آواز فضا میں پھیلی خاموشی میں شگاف کرتی تو یکا دکا کھلی کھڑکیاں کھٹاک سے بند ہو جاتیں، اور جھروکوں سے آنکھیں ہٹ جاتیں۔ ان بیزار کن اور بھیانک لمحات میں ایک آوارہ کتا ہی تھا جو گھبرا کر اس گلی سے نکلتا اور اُس گلی میں غائب ہو جاتا۔ لیکن چند لمحوں میں پلٹ کر پھر اس گلی میں آجاتا جیسے وہ دونوں گلیوں کے ٹوٹے رشتے کو جوڑنے کی تگ و دو میں ہو۔ روٹی تو اسے یہاں اور وہاں دونوں

جگہوں سے ملتی تھی۔ اور وہ کوئی انسان تو تھا نہیں کہ ایک کھونٹے سے بندھ جاتا۔

کئی دنوں سے فرقہ وارانہ فساد نے اس شہر کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہر ایک نے اپنی زندہ لاشوں کو اپنے اپنے گھروں میں دفن کر رکھا تھا۔ ہمکتی بھبڑکتی سڑکوں، مچلتی امڈتی شاہراہوں کی مانگیں اجڑ گئی تھیں دوکانوں کو اسقاط ہوگیا تھا، قبرستان کی کوکھ بھاری ہوتی جا رہی تھی، اور ندی کا مرگھٹ بے تحاشہ جاگنے لگا تھا۔

دو فرقے کے لوگ ایک دوسرے کی شہ رگ میں دانت گاڑے گرم گرم خون چوس رہے تھے۔

اس وقت پہلا اس گلی میں اپنے کمرے میں بیٹھا بند کھڑکی کے جھروکے سے باہر جھانک رہا تھا۔ ملٹری کا گشتی دستہ پاس سے گزرتا تو ان کے سروں پر ہیلمٹ اور ہاتھوں میں مشین گن دیکھ کر اس کا کلیجہ دہل جاتا، اور وہ خوف سے اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔ پھر جب بوٹوں کی آواز دور ہو جاتی تو وہ ہولے سے آنکھیں کھولتا اور ویران سڑک کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگتا کہ یہی وہ سڑک ہے جس کے سینے کو انسانوں کا ہجوم ہر وقت روندتا رہتا تھا اور سڑک بڑے فخر اور پیار سے ان کے قدموں کو بوسہ دیا کرتی تھی۔ وہی سڑک اس وقت کیسی اجڑی اور ویران پڑی تھی۔ جیسے بیوہ ہو گئی ہو۔ یہ سڑک صدیوں سے اس گلی سے نکل کر اس

گلی میں بڑے اطمینان سے گھسی پڑی تھی۔ اور اس اختلاط سے گویا دونوں سروں پر افزائش نسل ہوئی تھی۔ جو اس کی اولاد تھی وہ اپنی اولاد کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ابھی تک کتنی کشادہ، مسرور و مطمئن لگ رہی تھی۔ اس سڑک کے ہاتھوں کو اسی کی اولاد نے کاٹ ڈالا تھا اور وہ دونوں گلیوں کے بیچ پڑی سسک رہی تھی۔

اس خیال سے کہ کہیں دونوں فرقوں کی یہ مشترکہ ماں اولاد کے غم میں گھٹ گھٹ کر نہ مر جائے۔ اس کا دل بیٹھنے لگا، اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر اپنی ماں کی باہوں میں سما جائے۔ اور اسے قرار آجائے، اس نے کھڑکی پر اپنے کان لگا دیئے اور جب بڑی دیر تک بوٹوں کی آواز نہ آئی تو دھیرے دھیرے اس نے کھڑکی کے پٹ کھولے۔ باہر دور دور تک سناٹا تھا، کوئی متنفس نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ آوارہ کتا رہ رہ کر دونوں گلیوں کا چکر بدستور کاٹ رہا تھا، ایک لمحہ کے لیئے وہ ہچکچایا اور پھر ہمت کر کے کھڑکی سے باہر کود گیا اور سڑک کی چھاتی پر اپنی پیشانی رکھدی۔

اسی وقت اس گلی کے چند لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اس سے پہلے کہ وہ لوگ اس کے پیٹ میں خنجر اتار دیتے اسی گلی سے ایک دوسرا تیر کیطرح لپکا اور پہلے کو اپنے بدن سے ڈھانکتے ہوئے گڑگڑایا۔

نہیں، ایسا مت کرو، یہ میرا دوست ہے، میرا بھائی ہے، اس کی ماں کی گود میں میں پلا بڑھا ہوں۔ اور اس نے اپنی زندگی کی آدھی سے

زیادہ سانسیں ہماری گلی ہی نے لی ہیں۔ یہ تم سب جانتے ہو، اسے مت مارو یہ ہماری ہی گلی کا جزو ہے، ہمارے وجود کا آدھا حصّہ ہے۔"

لیکن ہاتھ اٹھ چکے تھے اور انہیں گرنا بھی تھا، وہ گرے بھی اور متعدد بار گرے لیکن پہلے پر نہیں بلکہ دوسرے پر، کہ دوسرے نے تو پہلے کو اپنے جسم سے ڈھانک رکھا تھا اور خنجروں کی بارش خود جھیل رہا تھا۔

اسی وقت آوارہ کتا اِس گلی سے نکل کر اُس گلی میں بھاگا۔ اور جب مطلع صاف ہوگیا اور حملہ آور اُس گلی میں بھاگ گئے اور دوسرا اپنا سارا خون سڑک کے سینے پر بہا کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ تو پہلے نے دوسرے کے سر کو اپنی گود میں لے لیا۔ اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

" میرے دوست، میرے بھائی تو نے میرے لئے جان تو دے دی لیکن میں تجھے مرنے نہ دوں گا، اپنے اندر زندہ رکھوں گا اور اپنے بعد اپنی نسلوں میں زندہ رکھوں گا۔ اور ان کے بعد ان کی نسلوں میں اور جب تک تو زندہ رہے گا یہ سڑک مر نہیں سکتی۔"

اسی وقت آوارہ کتا دوڑتا ہوا آیا اور آسمان کی طرف منہ اٹھا کر رونے لگا۔

خیر خیر خیر

نئے سورج کا نوحہ

عیدل نے گھوڑے کے منہ سے لگام نکالی۔ اس کی گردن کو بڑے پیار سے سہلایا۔ یکّہ کی پشت پر بندھی چارے کی بالٹی کھولی اور اسے گھوڑے کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

لہر کر طوفان، گاڑی آنے میں ابھی گھنٹہ بھر کی دیر ہے۔ تب تک میں ایک چائے مار لوں۔"

گھوڑے نے خوشی سے گردن ہلائی۔ اس میں بندھی گھنٹیاں بج اٹھیں اور سر پر لگی کلغی جھومنے لگی۔ اس نے اپنی تھوتھنی بالٹی کے اندر ڈال کر جسم ڈھیلا چھوڑا تو اس میں جھرجھری پیدا ہو گئی۔

عبدل نے گھوڑے کی پیٹھ تھپتھپائی' اور ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

گھاس پھوس کا بنا ہوٹل اس گاؤں کے اونگھتے اسٹیشن کا واحد ہوٹل تھا جہاں بورنگ نل کے رتیلے اور مٹ میلے پانی میں خالص دودھ کی چائے بنتی تھی اور مٹی کے کلڑھوں میں بکتی تھی۔ پتہ نہیں اصلی دودھ کا اثر ہوتا یا گاڑھے پانی کا یا پھر مٹی کے کوزے کا کہ چائے بڑی سوندھی ہوتی۔ اور جب دوپہر کی گاڑی دھواں پھینکتی ہوئی مسافروں کو اتارتی تو ہوٹل کا مالک لالہ بنواری لال اپنے آسن سے اچھل کر کھڑا ہو جاتا اور بھٹی کو دہکانے لگتا۔ اتنے میں مسافر آنا شروع ہو جاتے اور وہ جلدی جلدی چائے بنا کر کلڑھوں میں بھر بھر کر انہیں تھمانے لگتا۔ گھنٹہ آدھ گھنٹہ وہاں کافی چہل پہل رہتی۔ پھر لوگ اپنی اپنی منزلوں کا رخ کرتے اور گاؤں کا نیم خوابیدہ اسٹیشن خاموشی کے دبیز پردے میں محوِ خواب ہو جاتا۔ اسٹیشن ماسٹر اپنے کیبن میں تالا لگا دیتا اور گھر چلا جاتا اسے فکر ہی کیا تھی۔ دوسری گاڑی رات کے آٹھ بجے آتی اور تب تک وہ بے کار ہی رہتا ویسے گاڑی آنے پر بھی وہ کوئی کام نہ کرتا ٹکٹ تو خلاصی دیتا اور ٹکٹ چیک کرنے کی ضرورت یوں نہ تھی کہ کوئی ٹکٹ لے کر چلتا ہی نہ تھا۔ البتہ گاڑی کے وقت اگر سویپر اتفاقاً وہاں موجود ہوتا تو وہ مسافروں پر رعب جمانے کے لئے گیٹ پر کھڑا ہو جاتا لیکن سب جانتے تھے کہ وہ جھاڑو والا ہے۔ اس لئے لوگ اسے دھکا دے کر باہر نکل جاتے تھے۔ اسٹیشن سے تقریباً بیس کلو میٹر دور خدابخش گنج کی بازار تھی جہاں ایک کچی سڑک جاتی تھی۔ گاڑی سے اترنے والے مسافر عموماً آس پاس

کے گاؤں کے ہوتے جو اس سڑک پر یا کھیتوں سے گزرتی ہوئی پگڈنڈیوں پر چل پڑتے۔ البتہ جنہیں بازار تک جانا ہوتا یا جو بیمار ہوتا یا جو پڑھا لکھا ہوتا وہ عبدل کے یکہ کا سہارا لیتا اور ادبڑ کھابڑ سڑک کے پل صراط کو اٹھر پیر مناتا اور ہزاروں جھٹکے کھاتا بڑی مشکلوں سے پار کرتا۔

بنواری اس وقت اپنے جسم میں سرسوں کے تیل کی مالش کروا رہا تھا۔ بھٹی نیم گرم تھی، ایک پر المونیم کی کیتلی چڑھی ہوئی تھی اور دوسری پر دودھ پک رہا تھا جس کی سطح پر بالائی کی موٹی تہہ چڑھ گئی تھی کہ سڑکوں کے کنارے پکائے جانے والے دودھ کی بالائی کچھ زیادہ ہی فربہ ہوتی ہے۔ اس میں دودھ کے اجزا مخفی سے زیادہ گرد و پیش کے اجزاء ترکیبی کا دخل زیادہ ہوتا ہے۔

عبدل نے بنواری کو اوندھے منہ پڑا دیکھا تو پوچھا۔

"کیا بات ہے لالہ۔ آج گاڑی لیٹ ہے کیا؟"

آواز سن کر پہلے تو بنواری نے اپنے جسم کو کیکڑے کی طرح اچکایا پھر اٹھتے ہوئے بولا۔

آؤ عبدل۔ یہاں کوئی چیز لیٹ نہیں ہوتی۔ جو کام جس وقت ہو جائے وہی اس کا ٹائم سمجھو اور پھر گاؤں میں وقت کون دیکھتا ہے۔ بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ صبح ہوئی اور رات آئی۔ باقی حصہ پسینہ بہانے اور سو جانے میں نکل جاتا ہے۔ اور ایک دن یہ سپاٹ زندگی جس کا کوئی پلاٹ نہیں ہوتا۔ لیکایک ختم ہو جاتی ہے۔ جیسے چلتے چلتے میری سائکل کی ہوا نکل جائے۔ یا تمہارے گھوڑے کی لگام ٹوٹ جائے۔

—— چائے پیو گے ؟"

بنواری نے اپنا فلسفہ ایک جھٹکے سے ختم کر دیا۔ عبدل نے لکڑی کی بنچ کو انگوچھے سے صاف کیا اور بیٹھتے ہوئے بولا۔

بناؤ—— لیکن دودھ ذرا زیادہ ڈالنا۔ چائے ایسی ہو کہ پینے والا رٹری بھول جائے نہیں تو لسوڑے کی پتی پکا کر پی لینا ہی اچھا ہے کم از کم سردی زکام تو چلا جائے گا۔

بنواری ہنس پڑا، اس نے جلدی جلدی بھٹی دہکائی اور چائے بنا کر گلاس عبدل کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

" سنا ہے ہماری یہ سڑک پکی ہونے والی ہے۔"

عبدل کی آنکھوں کے سامنے اپنے شہر کی سڑک گھوم گئی۔ کشادہ چمکتی ہوئی جس پر موٹریں، اسکوٹر، رکشے اور دوسری سواریاں فراٹے بھرتی چلی جاتی ہیں نہ دھچکا نہ ہچکا نہ دھول نہ دھپّا، —— اس نے سوچا —— اگر ویسی سڑک مل جائے تو پھر اپنے طوفان کا کیا کہنا۔ ایسا دوڑے کہ راہ گیر سڑک چھوڑ کر درختوں سے جا لگیں وہ پھیرے پر پھیرے کرنے لگے اور دن بھر میں بیس تیس روپئے تو بچا ہی لے اگر قسمت سے ایسا ہو جائے تو اس کے دلدر دھل جائیں۔ بیوی کا علاج ہو جائے۔ بیٹی کی شادی ہو جائے، بیٹا پڑھ لے، بنئے کا قرض ادا ہو جائے، ایک نئی رضائی بنوا ڈالے، یکہ کی چھتری درست کروا ڈالے اگر یہ سڑک پکی ہو جائے۔"

عبدل کا ہاتھ کچھ جلنے لگا۔ تو اس نے چائے کا گلاس بنچ پر رکھ دیا ...

اور خوش ہوتے ہوئے بولا۔

تم نے بڑی اچھی خبر سنائی لالہ ـــــ کون کہتا تھا؟"

بنواری اپنے آسن پر بیٹھتا ہوا بولا

"کہنے کو تو سب تیس مار خاں بہت دنوں سے کہہ رہے تھے۔ ایم پی بھی کہتا تھا۔ ایم، ایل، اے بھی کہتا تھا۔ آلتو فالتو نیتا گنٹر بھی کہتے تھے۔ سب تو سب ایک بار ایک منتری جی بھی آئے تھے اور کبیر کی بانی بول گئے تھے۔"

بنواری نے کچھ اس طرح منہ بنایا کہ عبدل کو خطرہ لاحق ہوگیا کہ وہ نیتاؤں کو گالی دینے والا ہے۔ اس لئے جلدی سے اس نے اپنا سوال دہرایا

"لیکن اس بار کس نے بتایا"

بنواری کے چہرے کا تناؤ کم ہوگیا۔ بولا

"میں کل شہر گیا تھا۔ میرا بھتیجا پی، ڈبلو، ڈی میں چپراسی ہے وہ بتا رہا تھا کہ پلان پاس ہوگیا ہے اور کام بہت جلد شروع ہونے والا ہے چونکہ وہ چپراسی ہے اس لئے اس کی بات سچ لگی۔ کلرکوں نے بتایا ہوگا اور تم تو جانتے ہو اس دیش کا مالک کلرک ہے۔ اس کے اوپر تو سب دستخط ٹھکتار ہیں۔"

عبدل کو ہنسی آگئی۔ تھوڑی دیر وہ بنواری کی باتوں کا مزہ لیتا رہا پھر بولا۔ لالہ جی چاہتا ہے تجھے رس گلے کھلاؤں۔ تیری قسم اگر یہ سڑک پکی ہو جائے تو میرے تو دن ہی پھر جائیں۔ گھوڑے پر محنت بھی کم پڑے ابھی تو وہ ایسا ٹوٹتا ہے کہ دو، دو گھنٹے مالش کرتا ہوں

پھر بھی آپے میں نہیں آتا۔ میرا بدن خود بھی پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا ہے
پکی سڑک کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ گھوڑے کو ایک چابک لگاؤ پھر بیٹھ کر
مزے میں بیڑی پیو۔ وقفہ وقفہ سے ہٹو بچو کہتے جاؤ اور دیکھتے دیکھتے بازار
دھر لو مسافر بھی خوش گھوڑا بھی خوش اور خود بھی خوش۔"

اور خدا بھی خوش"

بنواری نے لقمہ دیا تو عبدل نے کہا — ٹھیک کہتے ہو لالہ —
کیونکہ خدا تو عبادت سے خوش ہوتا ہے۔ اور بندہ دلجمعی سے اسی وقت عبادت
کرتا ہے جب اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے، تن سلیقے سے ڈھکا ہوتا ہے، بیوی
بیمار نہیں ہوتی ہے، اور بیٹے بیٹیاں اپنے اپنے ٹھکانوں پر لگ جاتے ہیں۔
بھوک مرے اور دل جلے کس کی عبادت کریں اور کس بات کا شکرانہ ادا کریں"

وہ خاموش ہو گیا اس کی نگاہیں چھپر میں لگے مکڑی کے جالے میں
الجھ گئیں۔ جس میں ایک مکھی پھنسی ہوئی تھی۔ اور مکڑی اپنے شکار کو تک
رہی تھی۔ اس وقت گاڑی کی سیٹی سنائی دی۔ عبدل نے جلدی جلدی چائے
ختم کی اور اپنے یکہ کے پاس آیا۔ گھوڑا چارہ کھا چکا تھا اس نے بالٹی یکہ کی
پشت پر باندھ دی اور گھوڑے کے منہ میں لگام ڈالتے ہوئے بولا —
' طوفان، تیری بھی قسمت جاگنے والی ہے۔ پیارے"

تھوڑی دیر میں مسافر آنا شروع ہو گئے۔ انھیں دیکھتے ہی عبدل
آواز لگانے لگا۔

خدا بخش گنج بازار ایک روپئے۔

کچھ مسافر اپنی پوٹلیوں، بکسوں اور تھیلوں کے ساتھ یکہ میں بیٹھ گئے۔ اور جب یکہ میں جگہ باقی نہ بچی۔ یعنی لوگ چاروں طرف چمگادڑ کی طرح لٹک گئے تو عبدل نے یکہ ہانک دیا۔

اس دن شام کو گھر لوٹتے وقت عبدل نے بازار سے اپنی بیوی کیلئے گڑ کی جلیبیاں خریدی تھیں اس کی بیوی گڑ کی جلیبیوں پر جان دیتی تھی وہ جانتی تھی کہ عبدل جب بہت خوش ہوتا ہے تو گڑ کی جلیبیاں ضرور لاتا ہے اس نے مٹھائی کا دونا عبدل کے ہاتھ میں دیکھا تو کھانستے ہوئے پوچھا۔

کیا بات ہے آمنہ کے ابا؟

عبدل کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ کھونٹی پر لگام ٹانگتے ہوئے بولا۔

ہماری سڑک پکی ہونے والی ہے۔ لالہ بتا رہا تھا۔

پکی سڑک کا مطلب تو تم جانتی ہو نہ "

اتنا کہہ کر اس نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں جھانکا مگر انھیں کسی تاثر سے خالی پایا تو کہنے لگا۔

میں پھیرے پر پھیرے کر لوں گا۔ یہاں تک کہ رات کی گاڑی کے مسافر بھی لے جا سکوں گا۔ پھر ہماری آمدنی بڑھ جائے گی، تمہارا اچھے سے اچھا علاج ہوگا، بچوں کا بھی بھلا ہو جائے گا۔

— کچھ سمجھیں؟"

ٹی بی کے آخری اسٹیج پر پہونچ کر موت و زلیست کی کشمکش میں

مبتلا مرگھلی عورت کی سوئی سوئی نیم تاریک آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے وہ چمک پیدا ہو گئی جسے عبدل تلاش کر رہا تھا۔ کرب ناک حال کی حقیقت خوش آئند مستقبل کے تصور سے خلط ملط ہو کر ایک نقطہ پر جم گئی۔ عبدل نے اس ایک روشن نقطہ کو دیکھ لیا۔ اور مٹھائی کا دونا اپنی بیوی کی گود میں ڈال کر اطمینان سے باہر نکل گیا۔

بنواری کی خبر واقعی سچ نکلی۔ چند ہی دنوں میں سرکاری حرکت شروع ہو گئی۔ پہلے پیمائش والے آئے، چھکڑیاں آئیں، کول تار کے ڈرم آئے اور آخر میں روڈ رولرس آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیشن سے بازار تک ایک لمبی چمکتی سڑک رینگ گئی۔

جنوری کی پہلی تاریخ تھی، نئے سال کا آغاز تھا۔ اس دن فضا کہر آلود نہ تھی کئی دنوں بعد سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ اس کی ترچھی کرنیں خنک ہواؤں کے پردوں کو چیر کر دھرتی کے سینے پر بچھی شبنم کو چوس رہی تھیں۔ رات میں اوس نے سڑک کو غسل دے کر اس کے حسن کو نکھار دیا تھا۔ اس وقت وہ خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ جیسے کسی کے پاؤں کی آہٹ کا انتظار کر رہی ہو۔ اس کا افتتاح ہونے والا تھا۔ آس پاس کے بہت سارے لوگ اکٹھا تھے اور اس گھڑی کے منتظر تھے جب ڈپٹی منسٹر سڑک کے آر پار بندھے سرخ ربن کو کاٹنے والے تھے۔ سب کے چہروں پر مسرت رقصاں تھی اور وہ بار بار بل کھاتی سڑک کو دیکھ رہے تھے۔ اسی بھیڑ میں عبدل بھی شامل تھا اور خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

وقت مقررہ پر ڈپٹی منسٹر کی جیپ دھیرے دھیرے آگے بڑھی انھوں نے کھڑے ہو کر ربن کو قینچی سے کاٹا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور جے جے کار کے نعرے فضا میں گونج اٹھے۔ جیپ سرکتی ہوئی سڑک پر آگے بڑھی مجمع کھسکتا ہوا اس کے پیچھے چلا۔ زندہ باد کی تیز آواز کھیتوں اور کھلیانوں میں دوڑنے لگی اور درختوں میں چھپے ہوئے پرندے پھڑپھڑا کر اڑنے لگے۔ جیپ پر کھڑے منسٹر صاحب ہاتھ جوڑے مسکراتے رہے۔ مجمع ناچتا رہا۔ عبدل اس میں پیش پیش تھا وہ تالی بجاتے ہوئے ایسا بے قابو ہو جاتا کہ اس کا پورا جسم تھرکنے لگتا چند گز رینگ کر جیپ رک گئی۔ مجمع بھی تھم گیا منسٹر صاحب نے عوام کو مخاطب کیا۔

"یہاں کی جنتا کو نئے سال کا تحفہ دینے میں مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔"

وہ دس منٹ تک بولتے رہے اور پھر جے جے کار کے نعرے سمیٹ کر واپس چلے گئے۔

ایک گھنٹہ بعد سناٹا وہاں دوبارہ لوٹ آیا۔

گاڑی کے آنے میں ابھی دیر تھی۔ عبدل نے حسب معمول گھوڑے کو چارہ کھلایا خود چائے پی اور گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے مستقبل کا خواب بننے لگا۔ وہ اپنے خیالات کے حسین تانے بانے سے اس وقت نکلا جب سیٹی کی آواز اسکے کانوں میں پڑی۔ اس نے جلدی جلدی گھوڑے کی لگام کسی اس کی پیٹھ ٹھونکی اور چابک ہاتھ میں لے کر مستعدی سے کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں وہاں پھر چہل پہل ہوگئی۔ مسافر باہر آنا شروع ہوگئے تھے اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور حسبِ معمول آواز لگائی۔

" خدا بخش گنج ایک روپیہ"

اس بار اس کی آواز میں کچھ زیادہ ہی کھنک تھی اپنے جسم میں وہ بڑی طاقت محسوس کر رہا تھا آج اسے نئی سڑک پر اپنے یکہ کو دوڑانا تھا۔ اور اب تک کی تلخ یادوں کو گھوڑے کی ٹاپوں سے روند ڈالنا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ مسافر اس کے یکے کی طرف بڑھتے ایک بس گھڑگھڑاتی ہوئی وہاں آکر رکی اس میں سے پگڑی باندھے ہٹا کٹا ایک آدمی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا برآمد ہوا اور مسافروں سے مخاطب ہو کر زور سے بولا۔

چلو —— خدا بخش گنج صرف پچاس پیسے میں۔ آواز سن کر سارے مسافر بس کی طرف دوڑے منٹوں میں بس نے سب کو اپنے اندر سمولیا اور نئی نویلی سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

عبدل کے خوابوں کا محل آن واحد میں گر کر چکنا چور ہو گیا۔ دفعتاً اسے محسوس ہوا کہ اس کا بوڑھا اور ناتواں جسم بیوی کی لاش کو پشت پر لادے گھر سے نکل پڑا ہے۔ لیکن بیٹی چوکھٹ پار کرنے سے قاصر ہے اور بیٹا تاریک کوٹھری میں دیوار کی طرف منہ کئے اوندھا پڑا ہے۔

بڑی مشکل سے اس نے اپنے وجود کو دریافت کیا اور گھوڑے سے لپٹ کر رونے لگا۔ ••

لاشوں کی شناخت

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین پر فساد نہ پیدا کرو تو جواب دیتے ہیں ہم تو اصلاح کرنیوالے لوگ ہیں! آگاہ رہو کہ یہی لوگ فساد برپا کرنیوالے ہیں۔ لیکن یہ محسوس نہیں کرتے ہیں۔" (سورۂ بقر)

مولوی نقشبندی نے اس رات دھواں دھار تقریر کی تھی۔ میدان کھچا کھچ بھرا تھا۔ مجمع میں معتقدین اور مریدین کے علاوہ منکرین اور منافقین بھی شامل تھے۔ مولوی صاحب نے اپنے الفاظ کے زیر و بم لہجہ کے اتار چڑھاؤ، آواز کی نرمی و سختی، آنکھوں کی نمی و خنکی، ہاتھوں کی جنبش اور چہرے کے تناؤ سے وہ سماں باندھا تھا کہ معتقدین اور مریدین کا روتے روتے اور منکرین و منافقین کا ہنستے ہنستے برا حال تھا لیکن مزہ دونوں کو آیا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر کا نقش دونوں پر چھوڑا تھا۔

یہ بات اور تھی کہ نوعیت جدا جدا تھی   اول الذکر کو ایسا لگا

تھا جیسے وہ کسی انجانی وان دیکھی جگہ بیٹھے ہوں۔ اور ان کی نگاہوں کے
سامنے سے جنت اور دوزخ باری باری گزر رہی ہو۔ اور مؤخر الذکر کو
ایسا لگا تھا جیسے انھوں نے کسی نٹ کا تماشہ یا کسی مداری کا کرتب
دیکھا ہو ـــــ ان دونوں قوم کے دو جید فرقوں میں جو ایک دوسرے پر
مدتوں سے کفر کا فتویٰ صادر کرتے آئے تھے۔ ایک ایسی بحث چھڑ
گئی تھی جس سے دونوں ہی اپنی زندگی تو خیر ٹھیک ہے اپنے مذہب
کو بھی داؤ پر لگا بیٹھے تھے۔ اور ہر قیمت پر اپنی بات منوانے کے
درپے تھے۔

مسئلہ یہ چھڑ گیا تھا کہ پائجامہ کتنا لمبا پہننا چاہیئے۔ ایک فرقے
کا کہنا تھا کہ پائجامہ ٹخنے سے ذرا سا اوپر اٹھا رہے اتنا کہ ٹخنہ کھلا
رہے۔ مگر دوسرے فرقے کا کہنا تھا کہ یہ خیال صریحاً غلط ہے اور
اس پر عمل کرنے والا کافر ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پائجامہ اتنا نیچا
ہونا چاہیئے کہ ٹخنہ ڈھکنے نہ پائے۔ بس ذرا سا باقی رہ جائے۔ یہ
بات دوسری تھی کہ ملحدین اور منافقین کا کہنا تھا کہ دونوں میں تو
کچھ بھی فرق نہیں۔ بلکہ وہ تو یہ کہتے تھے کہ پائجامہ پہنا ہی کیوں جائے
اور یہ کہ اگر انسان کپڑے سے ہی بے نیاز ہو جائے۔ یعنی شرافت
کے ظاہری لبادے کو نوچ پھینکے، تو یہ حرکت فطرت کے عین مطابق
ہوگی۔ اور روئے زمین سے فساد کا قلع قمع ہو جائے گا ـــ مگر
یہ لوگ بصیرت سے محروم تھے۔ اس لئے ان کی بات کوئی نہیں سنتا

تھا۔ یہ لوگ تعداد میں تھوڑے تھے اور باقی لوگ ایمان کی دولت سے مالامال تھے اسی لیے انہیں فکر تھی کہ پاجامہ کی لمبائی کا تعین تو ہونا ہی چاہیئے ورنہ مالک حقیقی کو کیسے منہ دکھائیں گے۔

تو صاحب اس رات مولوی نقشبندی نے وہ دھواں دھار تقریر کی تھی کہ لوگوں کے دماغ روشن ہو گئے تھے۔ ان کے دلوں پر شیطان جو آبیٹھا تھا اٹھ کر بھاگا تھا۔ مگر منکرین و ملحدین کا کہنا تھا کہ شیطان تو اور ڈٹ کر بیٹھ گیا تھا، بلکہ لیٹ گیا تھا۔

خیر تو وہ سب کے سب کچھ نہ کچھ بولتے ہوئے تتر بتر ہو گئے تھے۔ اور اپنے اپنے گھروں میں جا کر بچوں کو مارا تھا کہ وہ ابھی تک سوئے کیوں نہیں تھے یا اتنی جلدی سو کیوں گئے تھے بیوی کو ڈانٹا تھا کہ وہ وعظ سننے کیوں نہیں گئی تھی۔ یا پھر گھر چھوڑ کر کیوں گئی۔ اور مولوی نقشبندی نے خاصہ تناول فرمایا تھا کہ کھانا اگر تقریر سے پہلے کھا لیتے تو گرانی کے باعث تقریر میں مزا نہ آتا۔ تقریر تو یوں ہو جاتی مگر ہلا دینے والی نہ ہوتی، ایسی نہ ہوتی کہ لوگوں کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑ پھڑانے لگتیں۔ اور دانت کٹکٹانے لگتے، ویسے بھی کھانا اگر پیٹ میں چلا جائے تو آدمی بولتا کم ہے بولتا تو ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے چیختا چلاتا ہے جو خالی پیٹ ہوتا ہے۔

اسی باعث مولوی نقشبندی نے خاصہ تقریر کے بعد تناول فرمایا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد انہوں نے کچھ گولیاں نگلیں تھیں۔

کچھ معجون چاٹے تھے۔ اور سونے کے کمرے میں جاتے جاتے اپنے حوازیوں سے کہتے گئے تھے کہ مخالف گروہ کے مولوی نے کل تقریر کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پاجامہ.....

مگر دیر یوں ہی ہو گئی تھی اب اگر مولوی صاحب مزید احکامات جاری کرتے یا فتویٰ صادر فرماتے تو صبح ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لئے ایک معتقد نے جو ابھی کم عمر تھا اور باوجود تزکیہ نفس کے رات میں گدگدانے والے خواب دیکھ ہی لیتا تھا کہ شیطان مردود کا کام ہی ہے کہ نیک مردوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹا دے۔ جلدی سے مولوی صاحب کی بات کاٹ دی۔

"حضرت آپ فکر نہ کریں ہم نے اپنے سروں پر کفن باندھ رکھا ہے"

"ماشاء اللہ" مولوی صاحب نے حلق سے نکالا۔ اور مسکراتے ہوئے حجرۂ استراحت میں داخل ہو گئے۔

صبح ہوئی تو ـــ لیکن ٹھہریے ـــ صبح ہونے سے بہت پہلے بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ مولوی نقشبندی نے جس وقت تقریر ختم کی تھی اور ان کے معزز سامعین کچھ نہ کچھ بولتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جاتے لگے تھے اسی وقت دوسرے فرقے کے مجاہدین اکا دکا آنا شروع ہو گئے تھے اور جب ایک طرف پورا میدان خالی ہو گیا تو دوسری طرف ایک چوتھائی بھر بھی گیا۔ آنے والوں میں کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں پانی سے بھری بالٹیاں تھیں۔ کچھ کے ہاتھوں میں جھاڑو تھے، کچھ لوبان اور اگر بتی لئے ہوئے تھے۔ ماچس تو سبھی کے پاس تھی۔ اس لئے کہ بیڑی سگریٹ

سبھی پیتے تھے۔ اس کے علاوہ کون جانے مولوی صاحب کب جہاد کا حکم دے دیں، ایسے موقعہ پر وہ آگ لگانے کے لئے ماچس کہاں ڈھونڈتے پھرتے۔ انہوں نے میدان جو مولوی نقشبندی اور ان کے سامعین کے وجود سے ناپاک ہوگیا تھا اچھی طرح دھونا شروع کیا، جب وہ پاک ہوگیا تو انہوں نے اس تخت کو جس پر کھڑے ہو کر مولوی نقشبندی نے ہلا دینے والی تقریر کی تھی، اپنے جوتوں، چپلوں سے خوب پیٹا، پھر اسے ایک کنارے کھڑا کر دیا، اس کی جگہ ایک دوسرا تخت لائے اسے بچھایا اور اسکے چاروں کھونٹ اگر بتی کھونس کر جلا دی۔

اور پھر وقت مقررہ پر وہ میدان ایک بار اور ان لوں کے مجمع سے کھچاکھچ بھر گیا۔ وہاں موجود ہر شخص بول رہا تھا اور ان کی آواز کی بازگشت دور دور تک پھیل رہی تھی، مولوی جبالوی ابھی تشریف نہیں لائے تھے کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ مولوی صاحب کھانا کھا رہے ہیں، کچھ دوسروں کا کہنا تھا کہ مولوی صاحب کھانا وانا کہاں کھاتے ہیں۔ وہ تو صرف پھل کھاتے ہیں اور لسی پیتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ مولوی صاحب عبادت میں مشغول ہیں اور بارگاہ الہیٰ میں دعا فرما رہے ہیں کہ اللہ مخالف گروہ کا منہ کالا کرا ور انہیں یہ توفیق عطا فرما کہ وہ پاجامہ کے صحیح مقام کا تعین کر سکیں۔ یعنی یہ کہ اس کی حد بندی کر سکیں۔ اس مجمع میں بھی مریدین و منافقین موجود تھے اور مزہ تو یہ کہ یہ لوگ وہی تھے جو کل والے مجمع میں شامل تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ دونوں مولوی اس وقت سازشی

کر رہے ہیں۔ ان کی بات سن کر دوسروں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں کہ حشر کے دن ان کے کانوں میں پگھلا سیسہ نہ ڈالا جائے وہ جانتے تھے کہ شامع کا حشر ایسا ہی ہونے والا ہے۔ ان کے خیال میں یہی وہ بہرے گونگے اور اندھے لوگ ہیں جو لوٹنے والے نہیں ہیں اور جن کا ذکر آسمانی صحیفوں میں بار بار آیا ہے۔

آخر کار مولوی صاحب آئے اور مجمع ایک بار ہل سا گیا جیسے زلزلے سے زمین دہلتی ہے۔ پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی، لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر تخت کی طرف دیکھنے لگے۔ مولوی صاحب اپنے قریب ترین کی معیت میں خراماں خراماں تخت تک آئے۔ وہ جوتا اتارنے کے لیے جھکے ہی تھے کہ ان کے ارد گرد بھنور بن گئی اور جوتا کیسے اور کہاں غائب ہو گیا انہیں پتہ ہی نہ چل سکا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ جب وہ جانے لگیں گے تو جوتا خود بخود ان کے پیروں میں گھس جائے گا۔ وہ عبا سنبھالتے ہوئے مائک تک آئے۔ مجمع پر طائرانہ نظر ڈالی، خاموشی کا پردہ اور دبیز ہو گیا، گردنیں زیادہ تن گئیں، آنکھوں نے پلک جھپکنے میں تاخیر کی حد کر دی، اور لوگ مجسم گوش بن گئے، چند لمحوں بعد آواز آئی۔

میرے بزرگو اور دوستو! ہمارے سامنے مسئلہ قوم کی زندگی اور موت کا ہے، مسئلہ عدم اور وجود کا ہے، مسئلہ صفر و کل کا ہے۔ مسئلہ فنا و بقا کا ہے۔ ہمارے حریف ہم سے برسر پیکار ہیں۔ لیکن اللہ جس کو چاہے ذلت دے اور جس کو چاہے عزت دے اور اگر ہم حق پر ہیں تو اللہ ہماری

مدد فرمائے گا۔ اگر وہ باطل پر ہیں تو غرق ہوں گے۔ سوال یہ نہیں کہ پاجامہ کتنا بڑا ہو یا کتنا چھوٹا ہو، سوال یہ ہے کہ قوم کے ناموس کی ستر پوشی اس سے ہوتی ہے اور وقت آنے پر قوم کے نام پر وہی اپنا سر پیش کرتا ہے۔ جس کے نام کے آگے لوح محفوظ پر شہید لکھا ہوا ہے اور جس کا والی انسان نہیں خدا ہوتا ہے۔

تو میرے بزرگو و دوستو! یہ بندہ فقیر یہ عرض کرتا ہے کہ پاجامہ اتنا لمبا ہو کہ ٹخنوں سے ذرا اوپر ٹھہر جائے نہ کہ اتنا چھوٹا ہو کہ ٹخنہ ذرا سا باقی رہ جائے۔ جیسا کہ ہمارے حریف جن کی حرکتوں پر امت مسلمہ کا سر شرم سے جھک جھک جاتا ہے، خیال کرتے ہیں۔ وقت میرے پاس کم ہے ورنہ میں یہاں اس پر فضا مقام پر اس مجمع ارباب حل و عقد کے سامنے جنکے دل نور ایمان سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن کے سینے میں شمع ہدایت فروزاں ہے کتابوں سے، صحیفوں سے، اقوال بزرگان سے، نگارشات اولیا سے مکتوبات صوفیا سے، مخطوطات علماء سے، یہ ثابت کر دیتا کہ پاجامہ اتنا ہی لمبا ہونا چاہیئے جتنا میں نے ابھی ابھی عرض کیا اس سے کم یا زیادہ خلاف شرع اور اس سے انحراف کرنے والا مرتد ہے اور آپ سب جانتے ہیں کہ مرتد کا مقام جہنم ہے۔ اس لئے وہ بہکے ہوئے لوگ جو مجھ سے متفق نہیں صریحاً اور قطعاً عذاب الٰہی کے مستحق ہیں اور جب یہ ثابت ہوا کہ وہ عذاب الٰہی کے مستحق ہیں تو پھر وہ ہم میں سے نہیں ہیں اور جو ہم میں سے نہیں ہے اس سے جہاد فرض ہے۔

یکایک ان میں سے جنہیں باقی لوگ یہ سمجھتے تھے کہ وہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں، اور آسمانی صحیفوں میں بار بار انہیں کا ذکر آیا ہے ایک شخص کھڑا ہو کر زور سے چیخا۔

یہ غلط ہے، فریب ہے، بکواس ہے"

وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کسی نے اس کے پیٹ میں چاقو اتار دیا۔ اور وہ چپ ہو گیا۔

پھر جب سارا ہنگامہ ختم ہو گیا، گھروں سے دھواں نکلنا بند ہو گیا، عورتوں اور بچوں کی چیخیں ماند پڑ گئیں، شعلوں کی لپلپاتی زبان پر پانی کی مقراض پڑ گئی تو سرکاری عملہ کے سامنے لاشوں کی شناخت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے ہر لاش کو بغور دیکھا، الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن ان کے چہروں پر جلد ہی مایوسی کی چھپت پڑ گئی۔ وہ حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے کیونکہ .....

پائجامہ تو کسی لاش کی ٹانگوں پر نہ تھا اور جن پر تھا بھی وہ اتنا پھٹ یا جل گیا تھا کہ لاش کا ٹخنہ ہی نہیں پوری ٹانگ برہنہ ہو گئی تھی۔

" پھر شناخت کیسے ہو ؟"

انہوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک کر حل تلاش کرنا چاہا مگر تمام کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھا۔

مجبور ہو کر انہوں نے تمام لاشوں کو اکٹھا کیا اور گاڑیوں میں لاد کر چلے گئے البتہ وہ ایک لاش جو سب سے زیادہ ٹھنڈی تھی چھوڑ گئے، کیونکہ اس لاش کی شناخت ہو گئی تھی۔

وہ لاش سر سے پیر تک ڈھکی تھی اور انسانوں میں کوئی اس کا والی نہ تھا۔ ●●

دھماکہ

کندھے پہ انگوچھا، جو کبھی لال رنگ کا ہوگا مگر اب گرد و غبار، پسینہ اور آنسو جذب کرتے کرتے مٹیالا ہو گیا تھا، رکھے میلی سی قمیص اور دھوتی جو کبھی سفید رہی ہوں گی مگر اب بھورے رنگ کی ہو گئی تھیں، پہنے بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے دھگو کھڑا تھا وہ اور اسی طرح کے درجنوں مزدور منڈولی چوراہے پر صبح سویرے آجاتے اور خدا کے ان بندوں کا انتظار کرتے جو انہیں ٹھونک بجا کر لے جاتے اور ہر مزدور کو ان کی جسمانی طاقت، ہنر اور مجبوری سے اپنی اپنی اوقات بھر فائدہ اٹھا کر شام کو چند سکے ان کے ہاتھوں پر تھما دیتے - ان ہی سے چند ہی خوش قسمت ہوتے جنہیں زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑتا۔ ورنہ زیادہ تر تو گھنٹوں بیٹھے رہتے، تب جا کر کوئی 'سیٹھ'، کوئی 'دلال'، کوئی ٹھیکیدار آتا اور انہیں

ہانک کرے جاتا، اکثر یوں بھی ہوتا کہ دبلا پتلا اور مریل جسم کا مزدور دن بھر بیٹھا رہتا مگر کوئی نہ پوچھتا اور جب سورج ٹاور کے پشت میں چھپ جاتا اور اس کا لمبا سایہ اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا تو وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا چلا جاتا اپنی کھولی پر۔

اس دن جگو بڑے سویرے آگیا تھا، اگلے دن اسے کوئی بھی مزدوری نہیں ملی تھی وہ شام تک آس لگائے بیٹھا رہا تھا پر کچھ نہ بنا تھا۔ اسکے جسم پر کھاتے پیتے سیٹھ ساہوکاروں کی نظر پڑتی تو وہ خوف سے کانپنے لگتا۔ پھر جب ان کی موٹی موٹی چمکتی آنکھیں دوسرے جسم کو ٹٹولنے لگتیں تو اس کا جسم ساکت ہو جاتا۔ انہی کیفیات میں کئی گھنٹے نکل گئے۔ اور جب سورج حسب معمول آدھی سے زیادہ مسافت طے کرکے ٹاور کے پشت میں چھپا تو وہ مایوس ہو کر چلا آیا۔ اس دن وہ بڑے سویرے جاگ اٹھا تھا۔ کھولی کے دوسرے لوگ ابھی خراٹے لے رہے تھے کہ وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ ریلوے برج کے قدموں میں جھونپڑیوں کی لمبی قطار تھی انہی میں رام دیال مستری کی ایک ۱۰ x ۱۰ کی کھولی تھی۔ جس کا کرایہ یوں تو دس روپیہ تھا مگر چونکہ انکی از راہ ہمدردی اپنے دیس کے دس لوگوں کو پناہ دے رکھی تھی، اس لیے ہر ایک سے دس روپیہ اصول کرتا تھا۔ ابھی اندھیرا تھا، جھونپڑیوں کے بیشتر لوگ سوئے ہوئے تھے اس لئے محض پانچ منٹ کے انتظار سے پاخانہ اور نل خالی مل گئے تھے وہ جلدی جلدی فارغ ہو گیا تھا، اور اپنے اڈے پر آ کھڑا ہوا تھا

جس وقت وہ آیا تھا چورا ہا تقریباً خالی تھا مگر آدھ گھنٹہ کے اندر اندر وہاں مزدوروں کی بھیڑ اکٹھا ہو گئی کسی کے ہاتھ میں پھاوڑا اور ٹوکری تھی۔ کسی کے ہاتھ میں آری اور رندا، کسی کے ہاتھ میں برش اور چونے کی بالٹی تھی، تو کسی کے ہاتھ میں کنی اور تسلہ، غرض اپنے اپنے پیشہ ہنر کے لحاظ سے لوگ سامان لئے ہوئے تھے مگر بہتیرے ایسے بھی تھے جو اس کی طرح خالی ہاتھ تھے۔ صرف دو ہاتھ لئے چلے آئے تھے۔ اس نے سوچا آخر خالی ہاتھوں سے بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہیئے، کوئی اوزار ہو، کوئی سامان ہو، کوئی سرٹیفکیٹ ہو، کوئی ڈگری ہو۔ اور اگر یہ سب نہ ہو تو لاٹھی ہی ہو۔ ڈنڈا ہی ہو، بلم تلوار یا چاقو ہی ہو، کوئی چیز تو ہو، خالی ہاتھ نہ ہوں۔ نامعقول لوگ، بھلا خالی ہاتھوں سے کچھ ملتا ہے، کبھی کچھ ملا ہے

" دھماکہ "

اخبار کے ہاکر کی تیز آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ چونک پڑا۔

" کیا ہوا" اس نے پاس کھڑے مزدور سے پوچھا۔

" سیٹھ بولتا ہے دو روپیہ مزدوری ہوگی۔ کام آٹھ گھنٹہ کا۔ میں بولا پھوٹو"

" میں پوچھتا ہوں یہ دھماکہ کیسا ہوا، اور تو سیٹھ کی ہانک رہا ہے

" کیا خبر" کہہ کر دوسرا مزدور بیڑی سلگانے لگا۔ جگو سوچنے لگا کیسا دھماکہ ہوا، بم تو نہیں گرا، لڑائی تو نہیں چھڑ گئی، چین یا پاکستان

نے حملہ تو نہیں کر دیا۔ بڑا غضب ہو جائے گا اگر ایسا ہو گیا ہو گا۔ کام ملنا اور مشکل ہو جائے گا، مہنگائی بڑھ جائے گی، اناج تیل، کپڑا سب مہنگا ہو جائیگا پھر وہ اپنا پیٹ کس طرح پالے گا۔ ہزار میل دور گاؤں میں اپنے بچوں کیلئے جو روپیہ جوڑ بٹور کر ہر ماہ بھیجتا ہے۔ وہ کس طرح بھیجے گا۔ بیمار بیوی کا علاج کس طرح کرائے گا۔ دوائیوں کی قیمت تو کئی گنا بڑھ جائے گی۔ بھگوان کرے لڑائی نہ چھڑی ہو۔

اس نے گھبرا کر دوسرے مزدور سے پوچھا۔

یہ لڑکا کس دھماکے کی بات کر رہا تھا"

"کون لڑکا؟ اس مزدور نے پوچھا

"ارے ابھی ابھی اخبار بیچتا ہوا گیا ہے۔ نہ۔

"اخبار"؟

"ہاں بھائی، اخبار"

وہ مزدور زور سے ہنس پڑا۔" اخبار"۔ پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل، ارے یہاں ٹھیکیدار پر نظر رہتی ہے۔ کان مزدوری کے ریٹ پر اور تو اخبار کی چاٹتا ہے۔

اخبار کے لئے پیسہ بھی ہے گا نہٹ ہیں۔

جگو سٹپٹا گیا، اور سوچنے لگا پچھلی جنگ میں کئی کئی دن اسے فاقہ کرنا پڑا تھا۔ بیوی روپیہ کے لئے بیرنگ خط لکھتی رہتی تھی، کبھی اپنی بیماری کا رونا، کبھی بچوں کے پیٹ اور تن کا، کبھی گھر کی خستگی اور

اور بنیئے کی سود کا، مگر وہ چپ سادھے رہتا، جواب بھی کیا دیتا، روپیہ نہیں تھا تو جواب کیا دیتا، الفاظ کتنے اچھے لکھو، تراش تراش کر، نوک پلک سنوار کر، رومان میں گھول کر، چاہے روشنائی سے لکھو، چاہے خون سے مگر جب تک یہ نہ لکھو کہ "روپیہ روانہ ہے" سب بیکار ہے، لکھا سب بے معنی ہے۔ اس کے پاس روپیہ تھا ہی نہیں تو خط کیا لکھتا۔ بہت دنوں تک خاموش رہا تھا۔ اور جب دن رات کی سخت محنت اور مشقت کے بعد وہ کچھ روپیہ جمع کر سکا تھا تو اس کا منی آرڈر کرایا تھا۔ پھر خط لکھا تھا۔ اسے کتنا بھلا لگا تھا جب ڈاکخانہ کے منشی نے لکھا تھا کہ "روپیہ روانہ کر دیا گیا ہے" اس نے کئی بار منشی سے خط پڑھوایا تھا اور جب اچھی طرح اطمینان کر لیا تھا کہ روپیہ روانہ کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے تو اس نے بڑی خوشی محسوس کی تھی ــــ یہ حالت تھی ان دنوں اب اگر پھر جنگ ...... اس کی سوچ کا سلسلہ پھر اخبار کے ہاکر نے منقطع کر دیا۔ جو چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہا تھا۔

"ایٹمی دھماکہ" ــ یکسپلوزن۔ دنیا ہل گئی، آج کی تازہ خبر، جگو کے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی، اس نے ادھر ادھر نظر ڈالی، سڑک کے اس طرف ایک بابو اخبار پڑھ رہے تھے وہ ان کے پاس گیا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

صاحب کیسی خبر ہے۔ کیا لڑائی شروع ہو گئی۔ بابو نے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وہ پان کھائے ہوئے تھے، اس لئے بول نہ سکے

ہاتھ کے اشارے سے اس سے ہٹ جانے کو کہا۔ جگّو نے وہاں سے کھسک جانے میں ہی نجات جانی۔ واپس آکر بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑا ہی ہوا تھا کہ اس کا پڑوسی اللہ رکھا، ہانپتا کانپتا آیا۔

"تیری عورت کا تار آیا ہے۔

"تار ؟ کیوں" کب، کیا ہے ؟

"لکھا ہے حالت اچھی نہیں ہے، جگّو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اللہ رکھا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا، بولا، ہمت رکھو جگّو۔ اللہ بہتر کرے گا۔ تو ایسا کر کہیں سے کرایے بھاڑے کا انتظام کر لے اور گھر چلا جا

جگّو تھوڑی دیر یونہی سر پکڑے۔ بیٹھا رہا۔ پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بڑی مشکل سے اٹھا، انگوچھے سے آنکھیں صاف کیں اور دھیرے دھیرے چلنے لگا، اللہ رکھا بھی ساتھ ہولیا وہ ابھی کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ اخبار والا لڑکا چلاتا ہوا پھر گزرا۔

جگّو نے اللہ رکھا سے پوچھا۔ " یہ کیسا دھماکہ ہوا ہے اللہ رکھے

" بم کا تجربہ ہوا ہے۔" اللہ رکھا نے بتایا۔

" یہ کیا ہوتا ہے۔

" لوگ کہتے ہیں کہ ایٹمی طاقتوں سے ملک کی ترقی اور تیز ہوگی۔ پہاڑ توڑے جائیں گے، زمین پھاڑی جائے گی، ندیوں کا رخ بدلا جائیگا

" لیکن فائدہ کیا ہوگا ؟

" پتہ نہیں۔ مگر لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا ملک طاقت میں چھٹے نمبر

پر آ گیا۔ اب ہم بچھڑے ہوئے نہیں کہلائیں گے۔ کچھ لوگ بہت خوش ہیں یونین والا رحمت علی کہہ رہا تھا کہ ہم ..... کہ ہم ..... کون سا پاور ہو گئے ہیں انگریزی میں کچھ اچھا ہی نام بتایا تھا۔ اب ہم پر کوئی ملک حملہ نہیں کرے گا سب کی نانی مرے گی۔

جگو کے مرجھائے ہوئے ہونٹ پر پھیکی مسکراہٹ رینگ گئی۔

چلو اچھا ہوا، یہ روز روز کی کھٹ کھٹ۔ اِس جنگ کا خطرہ اُس جنگ کا خطرہ ختم ہوا۔ مگر اللہ رکھے تم تو کہہ رہے تھے کہ بم کا استعمال ترقی کے لیے کیا جائے گا۔ یہ حملہ وملہ کی بات کہاں سے نکل پڑی مجھے جنگ سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

ڈرنے کی بات ہی ہے، لڑائی کوئی اچھی چیز تو نہیں مگر وہ رحمت علی دونوں باتیں ایک ساتھ بتا رہا تھا۔ یہ لوگ سب گڈ مڈ کر جاتے ہیں۔ اور نہ کریں تو لیڈری کیسے چلے صاف صاف بات کریں تو جنتا سمجھ نہ جائے اور اگر لیڈر کی بات جنتا کی سمجھ میں آ گئی۔ تو سمجھو اس کی دوکان بند وہ تب لیڈر نہ ہوا، پھسڈی ہوا، مگر ایک بات ہے جگو ملک کچھ ترقی ورقی کر گیا ہے شاید۔"

بڑا اچھا ہوا ملک ترقی کر گیا۔ جگو کے منہ سے آواز ایسی نکلی جیسے غار سے آئی ہو' اس کے بعد کوئی کچھ نہ بولا دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ آگے چل کر صرافہ بازار آ گیا، سڑک کے دونوں طرف سونے چاندی کی بڑی بڑی دوکانیں تھیں۔ چھتوں سے لٹکے فانوس سے

نکلتی رنگ برنگی روشنیاں جھاڑ سے ٹکرا کر شوکیسوں پر قوس وقزح بکھیر رہی تھیں، موٹے موٹے سیٹھ دانت نکالے گراہکوں کے سامنے بے شمار زیورات بکھیر رہے تھے، وہ دونوں نظریں چرائے چلتے رہے کہ کہیں دوکان دیکھنے کے جرم میں انہیں گرفتار نہ کر لیا جائے۔ پھر جب اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی "۱۱" منزلہ بلڈنگ آئی تو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے جگو کو ایسی ٹھنڈک کا احساس ہوا جو فلو کے مریض کو محسوس ہوتی ہے۔ اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوگئی، اس نے دھیرے سے اپنے ساتھی کو پکارا۔

"اللہ رکھے"

"کیا ہے"

"میں کس طرح گھر جاؤں، میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ تو ہی کچھ انتظام کر دے۔

اللہ رکھا نے گہری سانس لی۔ بولا۔

"کاش کہ میں اس لائق ہوتا۔ دو چار روپیہ کی بات ہوتی تو ادھر ادھر سے کر دیا جاتا مگر بات دو سو روپیہ سے کم میں نہ بنے گی اور اگر اتنے روپے میرے پاس ہوتے تو ....

وہ یکایک چپ ہوگیا، گرلس کالج کے گیٹ میں ہنستی قہقہہ لگاتی لڑکیاں داخل ہو رہی تھیں۔ وہ کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔ ایک ٹک بغیر آنکھیں جھپکائے دیوانوں کی طرح۔

اسے اس طرح بے خود پا کر جگو نے اس کا ہاتھ کھینچا۔

"اللہ رکھے"

"ہوں، اللہ رکھا چونک پڑا۔ اگر میرے پاس اتنا روپیہ ہوتا تو سلمیٰ کی سگائی ہی کیوں ٹوٹتی، میری بیٹی ابھی تک کیوں بیٹھی رہتی — میں نے رام دیال مستری سے پانچ سو روپے ادھار مانگا تو اس کمبخت نے کہا پانچ سو کیا ہزار دوں گا، اور واپس بھی نہ لوں گا اگر......

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی، دل بھر آیا، آگے کچھ نہ کہہ سکا جگو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بھائی اللہ رکھے، ہماری حالت کب سدھرے گی، آخر کب تک ہم اپنے بیوی اور بچوں کی جان و عزت کا خطرہ محسوس کرتے رہیں گے، آخر کب تک؟"

مگر اللہ رکھا کیا جواب دیتا، یہی سوال تو اس کے دماغ میں بھی، ٹھوکریں مار رہا تھا۔ شانے سے سٹکے تو لیئے سے آنکھیں صاف کرنے لگے۔

اتنے میں وہی اخبار والا لڑکا ادھر سے پھر گزرا، آج کی تازہ خبر ہندوستان میں ایٹمی دھماکہ" جگو کے کان میں گھنٹیاں بجنے لگیں، دماغ میں گھڑگھڑاہٹ ہوئی اور سر چکرانے لگا، اس نے لڑکے کو آواز دی لڑکا اخبار لیے پھرتی سے اس کے پاس آیا تو جگو نے اس کے منہ پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔

"یہ بھی کوئی تازہ خبر ہے سالے، ہمارے دماغ میں تو ہر دم دھماکہ ہوا کرتا ہے۔

تیسری نسل

پچھلے کئی برسوں سے اس گاؤں کے سر پر دمدار ستارہ لٹکا ہوا تھا۔
سورج غروب ہوتا اور سانولی سلونی شام اترنے لگتی تو یہ ستارہ گاؤں کے
اوپر آکر لٹک جاتا۔

پھر رات بھر لٹکا رہتا اور سورج نکلتے ہی غائب ہو جاتا۔
گاؤں والوں میں زیادہ وہ لوگ تھے جو دمدار ستارہ دیکھتے ہی خوشی سے
ناچنے لگتے ان کے چہروں پر شفق کی لالی پھیل جاتی، آنکھیں جگ مگ کرتے
لگتیں اور ان کے مضبوط اور کشادہ گھروں میں قمقمے روشن ہو جاتے۔ لیکن
اس گاؤں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو شام کے قدموں کی چاپ سنتے ہی اپنی
اپنی کوٹھریوں میں چھپ جاتے، کھڑکیاں اور دروازے بند کر لیتے۔ اور
اندھیرے کی چادر لپیٹ کر اپنے پیدا کرنے والے کو بڑبڑا کر یاد کرنے لگتے۔
اور باہر سے آنے والے قہقہوں اور کلکاریوں کی تیز آواز سے بچنے کے لئے
اپنے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے۔ پھر جب رات زیادہ گہری ہو جاتی

اور مضبوط اور کشادہ گھروں کے قمقمے بجھ جاتے، اور اطمینان وسکون کی ریشمی چادر ان کے مکینوں کو اپنی پناہ میں لے لیتی تو وہ لوگ اپنی اپنی کوٹھریوں سے نکلتے اور چھپتے چھپاتے بلّیوں کی طرح قدم اٹھاتے گاؤں کے باہر آتے اور ندی کے کنارے کھڑے ہو کر اس پار اپنی نگاہیں جما دیتے جہاں ایک دوسرا گاؤں آباد تھا۔ جس کے اوپر دمدار ستارہ نہ تھا وہ بڑی حسرت ویاس سے اس گاؤں کو دیکھتے رہتے یہاں تک کہ صبح ہو جاتی اور وہ سب گردن جھکائے سہمے ڈرے اپنے اپنے گھروں میں واپس آجاتے اس وقت دمدار ستارہ ڈوب چکا ہوتا۔

وہ لوگ ایک مدّت سے یہی کرتے آئے تھے پرانی نسل ختم ہو چکی تھی اس کے بعد کی نسل نے یہ روایت جاری رکھی تھی۔ کہ ان میں سے اکثریت نے وہ دن بھی دیکھے تھے، جب اس گاؤں پر کوئی دمدار ستارہ نمودار نہ ہوا تھا اور جب پہلی بار نمودار ہوا تھا تو وہ ڈر کر اپنے باپوں اور ماؤں کے جسموں میں منہ گاڑ کر سمٹ گئے تھے۔ تب سے وہ برابر یہی دیکھتے آئے تھے کہ گاؤں کے زیادہ تر لوگ دمدار ستارہ کے نکلتے ہی گھروں کے باہر خوشی سے ناچنے لگتے تھے۔ ان کے چہروں پر قوس و قزح کا چھڑکاؤ ہو جاتا تھا اور ان کے اپنے باپوں اور ماؤں کے چہروں پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا تھا اور وہ بھاگ کر اپنی اپنی کوٹھریوں میں دبک جاتے تھے۔ اور جب آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہوتی تو وہ چپکے سے چھپتے چھپاتے ندی کے کنارے آجاتے اور اس پار آباد گاؤں کو دیکھنے لگتے جس کے سر پر کوئی دمدار ستارہ نہ تھا۔ وہ لوگ وہاں

جانا چاہتے تھے ۔ لیکن درمیان میں گہری ندی حائل تھی ۔ اور ان کے پاس کوئی کشتی نہ تھی .... پھر جب افق پر صبح کی لالی بکھرنے لگتی تو وہ وہی رات کی مری چال چلتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں واپس لوٹ آتے ۔

ان کے باپوں نے یہی کیا تھا اور وہ بھی یہی کر رہے تھے ۔ لیکن پچھلے چند سالوں سے ان کے سامنے ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا تھا ۔ ہوا یوں تھا کہ جب شام ہوتی اور دمدار ستارہ نظر آجاتا اور ان کے چہروں پر کالے کالے بادل چھا جاتے اور وہ اپنے بچوں کو گھسیٹ کر گھروں میں قید کرنا چاہتے تو بچے سرکشی پر اتر آتے ..... "ہم دمدار ستارہ دیکھیں گے"... وہ اڑ جاتے وہ لوگ سمجھاتے، ڈراتے دھمکاتے، چمکارتے تبھی تب کہیں جا کر وہ اندر آتے لیکن جب رات آدھی ادھر آدھی اُدھر ہونے لگتی ۔ اور وہ لوگ ندی کے کنارے جانے لگتے تو بچے پھر اکڑ جاتے "ہم تو یہیں رہیں گے اپنے گھروں میں ندی پر کیا رکھا ہے"

"ندی کے اُس طرف وہ گاؤں ہے جس کے اوپر دمدار ستارہ نہیں ہے ۔" بڑے سمجھاتے ۔

"تو پھر؟" بچے جھنجھلا کر پوچھتے ..... "ہمیں اس گاؤں سے کیا مطلب؟"

"اس گاؤں سے ایک کشتی آنے والی ہے ۔ اس کشتی سے ہم لوگ وہاں چلے جائیں گے ۔ اور اس منحوس دمدار ستارہ سے نجات پا جائیں گے ۔" بڑے سمجھانے کی کوشش کرتے ۔

لیکن ایسے بچے جو سمجھدار ہو رہے تھے اور جنھیں اس پار گاؤں کا

کچھ کچھ علم ہو گیا تھا خفا ہو کر کہتے۔

" وہاں سے کوئی کشتی نہیں آئے گی۔ چھوٹا سا تو گاؤں ہے وہ وہاں کے لوگ اتنی بڑی کشتی کس طرح بنائیں گے کہ ہم سب اس میں آجائیں اس سے بڑی کشتی تو ہم ہی بنا سکتے ہیں۔ کہ ہماری تعداد ان سے زیادہ ہے "

اس گستاخی پر بڑے انہیں جھڑک لیتے

تم تو کاغذ کی ایک ناؤ بھی نہیں بنا سکتے کہ اس کے لئے ایک عدد کاغذ کا ٹکڑا چاہیئے اور وہ بھی تمہارے پاس نہیں ہے"۔

پھر بڑے انھیں گھسیٹ گھسیٹ کر چوکھٹ پار کراتے اور بلیوں کی طرح چلنے پر مجبور کرتے۔ لیکن وہ بچے جن کی مسیں بھیگنے لگی تھیں دمدار ستارہ دیکھنے سے باز نہ آتے وہ کسی طرح گردن جھکا کر چلنے پر راضی نہ ہوتے تھے اور جب وہ ندی کے کنارے پہنچ جاتے تو بڑے تو اپنے وجود کی تمام حسرتوں کو اپنی پلکوں پر بٹھا کر ندی کے دوسرے کنارے دیکھنے لگتے لیکن ان کی جوان ہوتی نسل ندی کی طرف اپنی پشت کر لیتی اور گاؤں کو دیکھنے لگتی جہاں ان کی کوٹھریاں تھیں اور جہاں صبح ہوتے ہی انھیں واپس جانا تھا وہ رہ رہ کر اپنے سروں پر لٹکتے دمدار ستارہ کو بھی دیکھ لیتی۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگتیں جیسے سرخ لوہے پر مسلسل ضرب لگائی جا رہی ہو۔

بڑے اس تبدیلی سے پریشان تھے اور فکرمند رہنے لگے تھے۔

اس سے پہلے کہ سرکشی حد سے بڑھ جائے وہ کسی صورت سے کشتی حاصل کر لینا چاہتے تھے۔ اور اس پار ہو جانا چاہتے تھے۔ لیکن سالہا سال کے انتظار

کے بعد اس پار سے کشتی نہ آئی تو انھوں نے سوچا شاید ادھر کے لوگ ہمارے انتظار سے غافل ہو(گئے ہوں) اور انہیں اس بات کا علم ہی نہ ہو کہ ہم کئی برسوں سے ندی کے اس کنارے ان کی کشتی کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو وہ اپنے اپنے ہاتھوں میں مٹی کے تیل کی شمعیں لے کر آنے لگے۔ یہ سلسلہ بھی کئی برسوں جاری رہا لیکن کشتی پھر بھی نہ آئی۔

دمدار ستارہ ان کے سروں پر لٹکا رہا اور وہ اپنی زندہ لاشوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے اُس پار سے آنے والی مدد کا انتظار کرتے رہے۔ ان کے بچے جوان ہونے لگے تھے۔ ندی کی طرف جانے سے صاف انکار کرنے لگے۔ ان میں سے تو کئی اتنے سرکش اور نافرماں بردار ہو گئے کہ وہ دمدار ستارہ نمودار ہونے پر اپنے گھروں میں چھپنے سے انکار کرنے لگے۔ وہ اس کی لمبائی ناپنا چاہتے تھے۔ اور اس کے منہ کا رخ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس لئے آدھی رات کو جب ان کے بوڑھے ہوتے والدین ندی کی طرف جانے لگتے تو وہ پہلو تہی کر جاتے اور راستہ بدل جاتے اب تو بڑوں کو اور بھی تشویش ہونے لگی آخر کار مجبور ہو کر انھوں نے خود ہی کشتی بنانے کا فیصلہ کیا کہ ان کی تاریخ میں کشتی کی بڑی اہمیت تھی۔ اور وہی ان کے وجود کی ضامن تھی۔

بڑی محنت و جانفشانی کے بعد آخر کار کشتی تیار ہو گئی پھر طے یہ پایا کہ جب رات آدھی اِدھر آدھی اُدھر ہو جائے تو تمام لوگ چپکے سے اپنے اپنے گھروں سے نکل پڑیں اور ندی کے کنارے اکٹھا ہو جائیں وہاں کشتی پانی میں لنگر انداز ہو گی وہ سب اس میں سوار ہو جائیں تاکہ پو پھٹنے سے پہلے لنگر کھول

دیا جائے۔

لیکن جب بڑے اپنے اپنے گھروں سے نکلنے لگے تو انھیں پتہ چلا کہ ان کے نوجوان گھروں سے غائب ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ شاید خون کی گرمی سے وہ ابل پڑے ہوں۔ صبر کا دامن چھوڑ دیا ہو اور ان سے پہلے ہی ندی پر پہنچ کر کشتی میں سوار ہو چکے ہوں یہ سوچ کر انھوں نے اطمینان کی سانس لی۔ اور حسبِ معمول بڑی احتیاط اور خاموشی سے چھپتے چھپاتے نگاہیں نیچی کیے ندی تک آ گئے۔

وہاں انھوں نے عجیب و غریب منظر دیکھا

سارے نوجوان وہاں موجود تھے لیکن وہ کشتی میں نہیں تھے۔ کشتی آگ کی لپیٹ میں تھی۔ انھوں نے اسے نذرِ آتش کر دیا تھا اور وہ اس طرح وہاں صف بستہ کھڑے تھے کہ ان کی پشت ندی کی طرف تھی اور نگاہیں دمدار ستارہ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس وقت ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور ان کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ بڑوں نے گھبرا کر اوپر دیکھا دُمدار ستارہ کی دُم غائب ہو چکی تھی۔

منکر نکیر سے پہلے

پھر یوں ہوا کہ تیسری بار بھی میں بچ گیا۔ حملہ آوروں نے تو مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن پیڈل رکشہ والا میرے پاس سے گزرتے ہوئے رُک گیا تھا اس نے مجھے رکشہ میں لادا تھا اور اسپتال پہنچا دیا تھا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ اس نے یہ جاننے کی قطعی کوشش نہ کی تھی کہ میری ذات کیا ہے۔ اور بغیر شناخت کے وہ مجھے اٹھا لایا تھا۔ آخر اس رکشہ والے نے اتنی بڑی غلطی کیسے کی کیا وہ قبل از تاریخ کا کوئی وحشی غیر متمدن اور بے ذات کا انسان تھا کہ فساد کے ایک شکار کو بس یونہی اٹھا لایا تھا بغیر دیکھے بھالے سوچے سمجھے ورنہ اس مہذب ملک کا پاگل سے پاگل شخص بھی پہلے خود کو مطمئن کرتا پھر ہاتھ لگاتا۔

تو اس طرح میں تیسری بار بھی بچ گیا۔ میں اس سے قبل بھی دو بار بچ چکا ہوں۔ سال رواں کا پہلا فساد جب پھوٹا ... میں یہاں عرض کرتا

چلوں کہ ہمارے ملک میں فساد پھوٹتا ہے اس طرح جیسے دھان پانی پاکر پھوٹتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ جب دھان پھوٹتا ہے تو دل شگفتہ اور دھرتی سبز ہوتی ہے اور جب فساد پھوٹتا ہے تو دل گزیدہ اور دھرتی سرخ ہوتی ہے۔ ویسے دونوں کا پھوٹنا آسان ہے۔ دھان چند قطرے پانی سے پھوٹتا ہے اور فساد صرف ایک عدد پتھر سے۔

تو جب اس سال فسادوں کے سلسلے کا پہلا کارنامہ رونما ہوا تو میں آفس میں تھا۔ خبر سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اس ہونے کے ساتھ خود کے نا ہونے کا جو احساس ناسور کی طرح اندر ہی اندر سڑ رہا تھا اس نے مجھے کرسی سے اچھال دیا۔ سب لوگ اچھلے کہ ناسور میرے اندر ہی نہیں پل رہا تھا۔ سبھی اس کے ساتھ جی رہے تھے۔ اور سبھی کو ابھی جینا تھا میں سیڑھیاں پھلانگتا بلڈنگ سے نیچے اترا۔ پارکنگ سے اسکوٹر نکالا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

پھر اس پل صراط پر کہ جس کے دونوں طرف الاؤ روشن تھے۔ مجھے چند لوگوں نے گھیر لیا۔ اور وہ سوال پوچھا جو اس ملک کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

"تمہاری ذات کیا ہے"

میں نے خود سوال پوچھنے والوں کی ذات کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔ ان کی داڑھیوں، موچھوں، گلوں اور کلائیوں کو نگاہوں سے ٹٹولا لیکن کوئی اندازہ نہ کرسکا۔ سوال دہرایا گیا پھر اس کی بارش ہونے لگی، اور ساتھ ہی ساتھ خنجروں کی چمک میرے حواس پر چھانے لگی۔ میں نے گھبرا کر کہا،

"میں مسلمان ہوں۔"

میرے منہ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ میرا لرزتا جسم خنجروں کی بارش جھیلنے لگا "ملیچھ" وہ سب ایک ساتھ دھاڑتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔

لیکن میں اس بار بچ گیا تھا۔ مقامی پولس جو گھومتی گھامتی وہاں بس یوں ہی اتفاقاً آگئی تھی۔ مردہ سمجھ کر مجھے اسپتال میں ڈال آئی تھی میرے اندر زندگی کی رمق باقی تھی اور خوش قسمتی سے میرا جسم ایک ایسے ڈاکٹر کے قبضہ میں آگیا تھا۔ جو صرف ڈاکٹر تھا اس کی کوئی ذات نہ تھی۔

اور جب اس سال فسادوں کے سلسلے کا دوسرا دور شروع ہوا اور میں اپنی کرسی سے اچھل کر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترا اور اسکوٹر دوڑاتا ہوا اسی پل صراط پر پہنچا تو اس بار میں تیار تھا۔

پل صراط کے دونوں طرف الاؤ روشن تھے۔ مجھے چند لوگوں نے گھیر لیا کہ یہ تو ہونا ہی تھا اور وہی سوال پوچھنے لگے جو اس ملک کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

"تمہاری ذات کیا ہے"

اس بار میں نے سوال کرنے والوں کو ٹٹولنے کی قطعی کوشش نہ کی بڑے اطمینان سے بولا:

"میں ہندو ہوں"

لیکن میرا جسم جو اس بار کمپوزڈ اور خوف سے مبرا تھا دفعتاً خنجروں کی زد میں آگیا۔ "کافر" وہ سب ایک ساتھ دہاڑتے ہوئے مجھ پر جھپٹ پڑے

لیکن اس بار بھی میں بچ گیا تھا۔ ایس۔ آر۔ پی کا ایک گشتی دستہ جو اتفاقاً
وہاں سے گزر رہا تھا اس نے مجھے مردہ سمجھ کر اسپتال کے حوالے کر دیا تھا۔
اور میری خوش قسمتی یا بد قسمتی کہ میں کچھ دنوں بعد گھر واپس آگیا تھا۔ اور اس
بار میں اسپتال میں پڑا ہوں تو یہ اسی سلسلے کی تیسری کڑی کے بل سے نکلی
داستان ہے۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا۔ لیکن پل صراط سے گزرتے ہوئے میں اس بار
پوری طور سے مطمئن تھا۔ دوسری اور تیسری کڑی کے درمیانی وقفہ میں، میں
نے بہت سوچا تھا اور اسپتال نہ جانے کی صورت نکال لی تھی۔ اور مطمئن تھا
کہ اس بار صحیح سلامت گھر پہنچ جاؤں گا۔ پھر جب ان لوگوں نے جنہیں رات
میں اپنے خداؤں کو حساب دینا تھا اور نقد لینا تھا مجھے گھیرا اور وہ سوال
پوچھا جو اس ملک کا سب سے بڑا المیہ ہے تو میں جھٹ بول اٹھا۔

"میرا کوئی مذہب نہیں"

لیکن اس سے قبل کہ میں مسکرا کر آگے بڑھ جاتا تیسری مرتبہ خنجروں کی زد میں
آگیا۔

"مارو سالے کو دہریہ ہے"

"مارو سالے کو ناستک ہے"

اس بار آوازیں ملی جلی تھیں اور خنجر پل صراط کے دونوں طرف سے لپک رہے تھے۔
اور پھر یوں ہوا تھا کہ وہاں پولس تاخیر سے بھی نہیں آئی تھی اور پیڈل رکشہ والا
مجھے اسپتال لے آیا تھا۔ میں پھر اچھا ہو رہا ہوں اور اسپتال میں پڑا پڑا سوچ رہا ہوں کہ
جب میں پل صراط سے چوتھی بار گزروں گا کہ گزرنا میرا مقدر ہے اور مجھ سے وہ سوال پوچھا
جائے گا۔ جو اس ملک کا سب سے بڑا المیہ ہے تو میں کیا جواب دوں گا۔

پچھلا دروازہ

انسپکٹر ۳۰۳ نے اکتائی ہوئی نظر پولس چوکی سے باہر سڑک پر ڈالی، ساری دوکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ آمد ورفت کا سلسلہ جاری تھا۔ اور ٹریفک کی گہما گہمی حسب معمول تھی۔ کہیں سراسیمگی، بدحواسی اور بدامنی کا شائبہ تک نہ تھا ایسا لگتا تھا کہ پورے شہر کی فضا پرسکون ہے۔ اور شب وروز اپنی تمام تر رعنائیوں، مصروفیتوں اور ہنگاموں کے ساتھ گزر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ پچھلے کئی دنوں سے فسادات نے شہر کے بڑے حصے کو اپنی لپلپاتی زبان سے چاٹ چاٹ کر سیاہ کر ڈالا تھا۔ گھروں کی دیواریں اپنے وجود سے محروم ہو گئیں تھیں اور ان کی چھتوں نے زمین اور آسمان کے درمیان پردہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آباد خرابے ہو گئے تھے۔

اور شہر خموشاں کی کوکھ اور چھاتی دونوں بھاری ہو گئی تھیں۔ اندرونی اور بیرونی اوزان تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ندی کا ہر گھٹ ہر وقت جاگا جاگا سا رہنے لگا تھا۔ آنے والوں کا سلسلہ جانے والوں کا سلسلہ، لامتناہی سلسلہ

رات جب آدھی عمر طے کر لیتی۔ تو عفریت شہر کی عنان لپک کر اپنے ہاتھوں میں لے لیتی، شعلوں کا رت جگا شروع ہو جاتا، اور لیمپ پوسٹ کی روشنی کا کلیجہ شق ہو جاتا۔ فضا میں چیخ و پکار، آہ و بکا بکھرنے لگتی، اور رہ رہ کر فائرنگ کی آواز کتوں کو مشتعل اور انسانوں کو مضمحل کرنے لگتی۔ ایک چیخنے لگتا اور دوسرا اپنی پوست میں سمٹ جاتا کہ حشر کے دن کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہوگا۔ اور ہر شخص اپنے اعمال کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے اپنے آپ سے فرار کا متلاشی ہوگا۔ اور جب رات تیسری حد پار کر لیتی تو کتے خاموش ہونے لگتے۔ اور انسانوں کے اعضاء ڈھیلے ہونے لگتے اور پھر دوسری رات آتی اور جب وہ اپنی آدھی مسافت طے کر لیتی تو ——

تو شہر کے تین چوتھائی حصے سے انسان غائب ہو گئے تھے اور قومیں بے دار ہو گئی تھیں۔ آدمی فرار ہو گیا تھا، اور فرقے پیدا ہو گئے تھے اور خدا کی سب سے عظیم تخلیق کی شناخت کا وسیلہ ستر فانی ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن شہر کے اس حصے اور باقی حصوں کے درمیان ایک لکچھمن ریکھا کھنچی ہوئی تھی۔ جسے عفریت پار کرنے میں ابھی تک ناکام رہی تھی۔ اس لئے یہ حصہ ابھی تک ہمک رہا تھا۔ جی رہا تھا۔

انسپکٹر ۳۰۳ اپنی کرسی پر اکڑوں بیٹھا اونگھنے لگا تھا۔

وہ کئی راتوں سے سو نہ سکا تھا۔ اسے اوپر سے حکم ملا تھا کہ شہر کے اس واحد پرسکون حصے میں کسی بھی قیمت پر کوئی گڑبڑی نہ ہونے پائے اور اسی لئے اسے چوبیس گھنٹے بیدار اور باہوش رہنے کی سختی سے تلقین کی گئی تھی۔

سب انسپکٹر کا نمبر ۱۴ اور آدھے درجن سپاہی گشت پر نکل گئے تھے اور باقی آدھے درجن سپاہی برآمدے میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ اور آپس میں ٹھٹھول کرتے ہوئے ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ رہ رہ کران کے قہقہے انسپکٹر ۳۰۳ کی سماعت پر ضرب لگاتے تو وہ چونک کر نیم خوابی کی گرفت سے آزاد ہوتا۔ اور کڑدی، کیلی، مچمچاتی آنکھوں سے سڑک کو دیکھتا جہاں ٹریفک اور انسانوں کی آمد و رفت معمول پر ہوتی۔ وہ من ہی من میں ایک موٹی سی گالی دیتا اور قلزم غنودگی میں دوبارہ غرق ہو جاتا۔ اور یہ سلسلہ شب کے نصف منزل تک پہنچنے تک جاری رہتا۔

اس رات جب سڑک کی مانگ اجڑ گئی، دوکانوں نے پردہ کر لیا اور فضا میں دن کے ہنگاموں کی بازگشت سنائی دینے لگی اور ریکھا کے اس پار کتنے ماتل بہ فریاد ہو گئے۔ شعلوں نے اپنی زبانیں لمبی کر لیں اور دھماکوں کی آواز ہر جہت سے آنے لگی تو دفعتاً سیکرٹ فون کی گھنٹی بجی۔

انسپکٹر ۳۰۳ نے ہڑبڑا کر ریسیور اٹھایا اور بھاری آواز میں بولا

"چوکی ۱۴ انسپکٹر ۳۰۳ رپورٹنگ سر"

"ادھر کا حال بولو" ـــ دوسری طرف سے آواز آئی۔

"سب ٹھیک ہے سر۔ نو پرابلم" اس نے مری دبی آواز میں جواب دیا۔

"گڈ" ادھر سے آواز آئی ـــ "دیکھو انسپکٹر ۳۰۳ پورے شہر میں تمہاری چوکی ہی سلامت ہے۔ باقی حصہ تو جل رہا ہے۔ تمہیں الرٹ رہنا ہے اور دیکھو چوکی پر تمہاری چوبیس گھنٹے کی حاضری ضروری ہے ایک منٹ کے لئے بھی ڈیوٹی آف نہیں ـــ کیا سمجھے؟ ہم ہر آدھے گھنٹے بعد حال چال پوچھا کریں گے۔ اور اگر تم کسی وقت بلا وجہ غائب رہے تو سخت کارروائی کی جائے گی ـــ کیا سمجھے؟"

"یس سر۔ میں نے تو پچھلے ایک ہفتے سے ایک منٹ کے لئے بھی چوکی نہیں چھوڑی۔

"فائن"

"بس یہیں بیٹھا رہتا ہوں۔ ویسے بیکار ہی بیٹھا ہوں۔ یہاں تو سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے سا ـــ"

وہ گالی دیتے دیتے رک گیا۔

اس کے دفعتاً خاموش ہو جانے پر اُدھر سے پوچھا گیا۔

"ہاں کیا کہہ رہے تھے۔"

انسپکٹر ۳۰۳ کو پسینہ آگیا۔ جلدی سے بولا

"ساری ساری رات بیٹھا رہتا ہوں سر"

"ویری گڈ" بیٹھے رہو۔ اور آنکھ اور کان کھول کر بیٹھو۔ کیا سمجھے؟

"یس سر" پچھلے ایک ہفتے سے میں ایک گھنٹہ کے لیے بھی نہ سو سکا۔ ویسے جاگنے کی بھی کوئی خاص وجہ نہیں۔ یہاں تو کوئی گڑبڑی ہے ہی نہیں

انسپکٹر ۳۰۳ کا لہجہ شکایتی ہوگیا۔ اس پر ادھر سے تنبیہہ ہوئی

"سونے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"یس سر! کئی دن ہو گئے بیوی بچوں سے ملنے گھر بھی نہیں گیا"

"شٹ اپ"

"یس سر"

اور کان کھول کر سن لو اگر تمہارے علاقے میں بدامنی پھیلی تو سخت کاروائی کی جائے گی۔ ہیڈ کوارٹر سے پھر دھمکی ملی۔

انسپکٹر ۳۰۳ نے سہمی آواز میں "یس سر" کہا اور جب ادھر سے کنکشن کٹ ہو گیا تو اس نے بھی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور اپنے افسر کو گالیاں دینے لگا۔

اندرونی غبار کو اچھی طرح اگل دینے کے بعد اس نے سڑک پر نظر ڈالی جہاں سناٹا پورے شباب پر تھا۔ دور دور تک کوئی متحرک شے نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کے سپاہی تاش کھیلنے میں مشغول تھے۔ اور بات بات پر اپنی رانوں کو ٹھونک رہے تھے اس نے غصیلی نگاہوں سے انھیں دیکھا اور تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

"ہالٹ"

سارے سپاہی چونک کر انسپکٹر ۳۰۳ کو دیکھنے لگے۔

گھوڑی کی اولاد و یہ بھی کوئی تاش کھیلنے کا وقت ہے۔"

انسپکٹر ۳۰۳ برس پڑا۔

سپاہیوں نے پتے سمیٹے اور منہ ہی منہ میں انسپکٹر ۳۰۳ کی ماں بہنوں کو روندڈالا۔

جاؤ گشت پر۔ یہاں بیٹھے کیا گھاس کھود رہے ہو۔ اس نے حکم دیا۔ سارے سپاہی اٹھ کھڑے ہوئے انھوں نے اپنے کندھوں پر رائفلیں لٹکائیں اور چوکی کی سیڑھیاں اتر کر سڑک پر ہو لئے اور تھوڑی دیر میں اگلے موڑ پر جاکر انسپکٹر ۳۰۳ کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

انسپکٹر ۳۰۳ کو دفعتاً احساس ہوا کہ وہ بالکل اکیلا ہو گیا ہے اور دور دور تک زندگی کے آثار نہیں۔ اس نے جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالی۔ اور سگریٹ جلانے کے لئے جیسے ہی اس نے ماچس جلائی اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

اور اس کے ساتھ اس نے گالیوں کی قے کر دی۔

اس نے جلدی جلدی سگریٹ کے تین چار کش لئے۔ اور پھر اسے پیر سے کچلتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور اپنی موٹر سائیکل کے پٹرول ٹینک میں ڈال کر اسے باہر نکال لیا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا بڑی تیزی سے چلتا ہوا سڑک کے اس پار جنتا پراویزن اسٹور کے پاس جاکر رک گیا۔ اس نے چور نگاہوں سے اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ ہو کا عالم بدستور تھا۔ اور خاموشی کی دبیز چادر ماحول پر پڑی ہوئی تھی۔

جس میں کسی دوکان کے چبوترے پر اپنے جسم کو رگڑتے ہوئے۔ ایک خارش زدہ کتا پک پکا کر سوراخ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک گائے بیٹھی ہوئی مزے میں جگالی کر رہی تھی۔

اس نے اطمینان کی سانس لی اور پٹرول میں بھیگا ہوا رومال شٹر کے دروازے سے اندر گھسیڑ دیا اور اسی کے ساتھ ماچس کی جلتی ہوئی تیلی بھی اندر کر دی۔

اور صبح جب اس علاقے میں کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ اور ملٹری نے چوکی کو اپنی تحویل میں لے لیا تو انسپکٹر ۳۰۳ کی ڈیوٹی خود بخود آف ہو گئی۔ اور وہ گھر جا کر اطمینان سے سو گیا۔

نام ——— سید ظفر الحسن ہاشمی

پیدائش ——— جولائی ۱۹۴۰ء

تعلیم ——— ایم۔کام۔ (گورکھپور یونیورسٹی)

آبائی وطن ——— موضع بہرونرپور، پوسٹ سوراپور تحصیل ٹانڈہ
ضلع فیض آباد، یوپی

ملازمت ——— آڈٹ آفیسر۔ اکاؤنٹنٹ جنرل آفس احمدآباد
گجرات

تصانیف

منزل تک (ناول) 1981

منتخب افسانے (انتخاب) 1990

عجیب بات ہے (افسانے) 1990